

اردو افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کی پیش کش

Representation of Anglo-Indian characters in Urdu Short Stories

Abstract:

This study examines the representation of Anglo-Indian characters in Urdu short stories, focusing on the relationships between Anglo-Indian married couples, their descendants, the British community, and the indigenous population. The Anglo-Indian community emerged as a result of intermarriages between employees of the British East India Company and native women. These relationships often generated economic, social, and psychological challenges for the women involved and for their children, giving rise to a distinct social group within colonial society. Although Anglo-Indians appear in Urdu fiction, they have received little attention in Urdu literary research and criticism. This study seeks to address that gap by analysing the ways in which Urdu short stories portray members of this community. The findings show that Anglo-Indian characters are generally presented as secondary and marginalised figures rather than as central protagonists. Moreover, the representation is largely confined to Anglo-Indian women, who are frequently depicted as belonging to the lower strata of society. Such characters commonly appear in the roles of prostitutes, maids, nurses, or film actresses. The study argues that these literary portrayals create a limited and often stereotypical image of the Anglo-Indian community. By examining the economic, social, and psychological dimensions attributed to these characters, it demonstrates that the reality depicted in Urdu fiction does not fully correspond to the historical circumstances of Anglo-Indians. Consequently, the study highlights the gap between literary representation and historical reality, while drawing attention to an overlooked aspect of Urdu fiction and colonial social history.

Keywords: Urdu Short Story, Anglo-Indian Community, Identity crises, History, Reality, Psychology.

اردو افسانے کا موجودہ قاری، شاید ہی اینگلو انڈین کرداروں سے واقف ہو۔ حالاں کہ آزادی سے پہلے کے اردو افسانے میں یہ کردار کثرت سے ملتے ہیں۔ نو آبادیاتی عہد میں وجود میں آنے والا یہ طبقہ رفتہ رفتہ افسانے سے غائب ہوتا چلا گیا۔ اس مقالے میں،

اردو افسانے کے ان فراموش کردہ کرداروں کا مطالعہ مقصود ہے۔ اس مطالعے کا ایک مقصود یہ ہے کہ ان کی مدد سے، نوآبادیاتی مغرب کے برصغیر کے سماج، ثقافت اور ادب پر اثرات کو سمجھا جاسکے۔

اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں اینگلو انڈین کی اصطلاح، دو قسم کے طبقے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پہلا: ”۳ برطانوی نژاد جو عرصے تک ہندوستان میں رہا ہو یا رہتا ہو“۔ جب کہ دوسرا ”۳ برطانوی ہندی مخلوط نسل کا (شخص)“۔ مثلاً عصمت چغتائی کے افسانے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کا مرکزی کردار ایرک ولیم جیکسن، اس کی مثال ہے۔ اس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ برطانوی مرد کے ہندوستان کی مقامی عورت سے شادی یا ناجائز تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے بھی اینگلو انڈین کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی ہی کے مذکورہ بالا افسانے میں دو اینگلو انڈین بچوں پٹو اور فلومینا کا ذکر ملتا ہے جو ایرک ولیم جیکسن کے اپنی نوکرانی سکھوبائی سے ناجائز جنسی تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

اینگلو انڈین کی اصطلاح کب استعمال ہونا شروع ہوئی؟ گلو ریاجے مور (Gloria J. Moore)۔ پ: ۱۹۳۵ء کی تحقیق کے

مطابق:

پہلی بار اینگلو انڈین کی اصطلاح اٹھارہویں صدی میں وارن ہسٹینگز (Warren Hastings) نے ہندوستان میں رہنے والے برطانوی باشندوں اور ان کے ہندوستانی بچوں کے لیے استعمال کی۔ انیسویں صدی میں برطانوی باشندوں نے صرف گورے رنگ کے، معاشی طور پر مستحکم اینگلو انڈین ہی کو اینگلو انڈین کے طور پر قبول کیا؛ جب کہ کالے رنگ کے، غریب لوگوں کو یوریشین کا نام دیا گیا۔^۲

گویا انیسویں صدی میں اینگلو انڈین اور یوریشین کے درمیان ایک تفریق قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۱۱ء کے بعد گورنمنٹ آف لارڈ ہارڈنگ نے سرکاری طور پر، دو مختلف نسلوں کے اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مخلوط بچوں کے لیے باقاعدہ اینگلو انڈین کی اصطلاح استعمال کر کے اس تفریق کو ختم کیا؛ وگرنہ ۱۹۱۱ء سے قبل اینگلو انڈین کے لیے ہاف اینڈ ہاف، ہاف کاسٹ، ہاف بریڈ، انڈو برہمن، ایسٹ انڈین، یوریشین اور لوزوانڈین جیسے طرح طرح کے غیر اخلاقی و غیر مہذب الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ ”اینگلو انڈین پہلے دن سے ہی اینگلو انڈین نہیں کہلائے؛ بلکہ یہ یوریشین اور لوزوانڈین کہلانے کے بعد اینگلو انڈین کہلائے۔“^۳ اینگلو انڈین ان تمام اصطلاحات کی نسبت قدرے قابل قبول اصطلاح ہے کہ اس اصطلاح میں دو نسلوں کے ایک دوسرے سے متغائر ہونے کے بجائے کسی حد تک ہم آہنگ ہونے کا احساس ملتا ہے۔ اسی لیے اس اصطلاح کو مذکورہ تمام اصطلاحات کی ترقی یافتہ صورت گردانا گیا ہے۔

یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی سامنے رہے کہ غیر ملکیوں کے ہندوستان کی مقامی عورتوں سے شادیاں کرنے کا رواج نیارواج

نہیں تھا۔ اجنبی مردوں کی ہندوستانی عورتوں سے شادی کا آغاز پرتگالیوں نے کیا تھا۔

البوریک نے ہندوستان میں پرتگالیوں کی نوآبادیاں قائم کرنے کے لیے پرتگالیوں کو دیسی عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دی۔^۲

پیش نظر رہے کہ شروع میں لوزوانڈین (Luso-Indians) کی اصطلاح پرتگالی مردوں اور ہندوستان کی عورتوں سے پیدا ہونے والے بچوں کے لیے ہی استعمال کی گئی تھی (Luso سے مراد پرتگالی ہے جو اس علاقے کے لاطینی لفظ Lusitania سے ماخوذ ہے)، لیکن پیش تر انگلش اور اردو لغات میں اینگلو انڈین کی اصطلاح کی تاریخ اور اس کے ارتقا کی حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا گیا (یعنی یوریشین، لوزوانڈین اور اینگلو انڈین کے درمیان فرق کو واضح نہیں کیا گیا)؛ بلکہ انگریزی (اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری^۳) اور اردو لغات (اردو لغت تاریخی اصول پر^۴، علمی اردو لغت^۵، جامع اللغات^۶) میں یوریشین اور اینگلو انڈین کو مترادف الفاظ کے طور پر ہی لیا گیا ہے۔ ان تمام لغات میں یورپ و ایشیا سے تعلق رکھنے والے اُس انگریز کے لیے بہ یک وقت یوریشیائی اور اینگلو انڈین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جو ہندوستانی ماں اور یورپی باپ سے ایشیا میں پیدا ہوا اور ایشیائی میں کچھ عرصے کے لیے یا مستقل طور پر رہا ہو۔

ماحصل یہ کہ پہلی صورت میں اینگلو انڈین اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا باپ یورپی ہو؛ جب کہ ماں ہندوستانی۔ دوسری صورت میں اینگلو انڈین اُن برطانوی مردوں اور عورتوں کو کہا جاتا ہے جو ہندوستان میں دیر تک رہے ہوں۔

اردو افسانے میں اینگلو انڈین مذکورہ دو صورتوں ہی میں نہیں، تین چار صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک، یورپی باپ اور ہندوستانی ماں کی اولاد کی صورت میں۔ دو، محض میاں بیوی کی صورت میں۔ تین، ہندوستانی عورت سے ناجائز جنسی تعلقات کی صورت میں اور چار، وہ اینگلو انڈین جن کا اردو افسانے میں کسی مقامی خاتون سے شادی اور پھر اولاد کا ذکر نہیں ملتا؛ تاہم وہ ایک عرصے سے ہندوستان میں رہ رہے ہوتے ہیں۔

اردو افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کی پیش کش سے قبل، اینگلو انڈین مردوں، عورتوں اور ان مردوں اور عورتوں سے پیدا ہونے والے بچوں سے متعلق چند بنیادی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً پہلا سوال یہ کہ برطانوی باشندوں کو ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی؟ دوسرا سوال یہ کہ ہندوستانی عورتوں سے پیدا ہونے والے بچوں کے ساتھ یورپی باپوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس قسم کا سلوک روار کھا؟ انھوں نے معاشرے میں ان کو کیا مقام دیا؟ پھر تقسیم کے بعد ہندوستان میں اُن کی سماجی، معاشی اور نفسیاتی صورت حال پہلے جیسی ہی رہی یا اس میں کچھ تبدیلیاں بھی آئیں؟ تبدیلیاں آئیں تو ان کی نوعیت کیا تھی؟ کیا اب بھی اینگلو انڈین طبقہ وجود رکھتا ہے؟ ہے تو کہاں؟ اور پھر آخری مرکزی سوال کہ اردو افسانے میں اس اینگلو

انڈین طبقے کا ذکر کس کس پیرائے میں ہوا ہے؟

جہاں تک برطانوی مردوں کی ہندوستانی عورتوں سے شادی کا سوال ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پرتگالیوں کی طرح، وہ بھی، آغاز میں، ہندوستان میں اکیلے آیا کرتے تھے۔ سترھویں صدی کی ابتدا میں، ایسٹ انڈیا کمپنی یورپی خواتین سے، کمپنی کے مرد ملازموں کی شادی کے انتظامات کرتی رہی مگر اس سے کمپنی کے اخراجات بڑھ گئے۔ ذرائع آمد و رفت کے مسائل، اس پر مستزاد تھے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگالی طریقہ اپنالیا۔ یعنی ہندوستانی عورتوں سے، انگلستانی مردوں کی شادی کی اجازت دے دی۔ اول اول کمپنی کے ملازموں نے پرتگالی یا یورپی عورتوں کو ترجیح دی، لیکن چونکہ ہندوستان میں یورپی عورتوں کی تعداد قلیل تھی، اس لیے انھیں مقامی عورتوں کی طرف بھی دیکھنا پڑا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مقامی عورتوں کو شادی سے قبل چرچ میں پستسمہ کی مذہبی رسم ہی نہ ادا کرنا پڑتی بلکہ انھیں اس نئی زندگی کے لیے اور بھی بہت کچھ قبول کرنا اور چھوڑنا پڑتا۔ اس اینگلو انڈین شادی شدہ جوڑے کو ہرنچے کی پیدائش پر کمپنی کی جانب سے، مناسب حد تک خاندانی اعزازیہ (فیملی الاؤنس) ملتا تھا۔

سترھویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹرز کی جانب سے ہرنچے کی پیدائش پر اینگلو انڈین شادی شدہ جوڑے کو فیملی الاؤنس کے طور پر ایک پگڈایا سونے کی مہر دی جاتی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان کے مختلف حصوں پر اقتدار قائم کر لیا اور اس کے یورپی ملازمین کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا تو اینگلو انڈین طبقے کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ تاہم انیسویں صدی کے وسط میں، ذرائع آمد و رفت بہتر اور سہل ہو گئے تو یورپی مرد اپنی ہم نسل خواتین سے ازدواج کو اہمیت دینے لگے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ رفتہ رفتہ انگلستانی مردوں نے مقامی عورتوں سے ازدواجی تعلق قائم کرنا کم کر دیا؛ بلکہ کئی انگلستانی باپوں نے تو اپنے بچوں کو محض ان کی ماؤں کے یا چرچ کے زیر انتظام یتیم خانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اب یورپی مرد مقامی ہندوستانی عورتوں کو داشتہ اور طوائف کے طور پر ترجیح دینے لگے۔ یوں معاشرے کے اندر بھی ان اینگلو انڈین عورتوں اور بچوں کے لیے تعصب اور حقارت کے جذبات پلنے لگے۔ کئی عورتیں، جنھوں نے اپنے ماضی میں تمام رشتہ داروں سے تعلق کو ایک طرف کر کے ایک گورے سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا؛ انھیں سماجی و ثقافتی تنہائی کا کرب بھی سہنا پڑا۔ آگے چل کر، یعنی تقسیم کے بعد ان عورتوں کی اولاد کو تنہائی کے علاوہ، سماجی اجنبیت اور بے گانگی کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ وہ شناخت کے انوکھے بحر ان کا شکار ہوئے۔ وہ اپنی جڑیں کہاں تلاش کریں؟ ہندوستان میں یا باہر؟

مقامی عورتوں اور ان سے پیدا ہونے والے بچوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے شروع دن سے ہی محض ایک ضرورت کی چیز سمجھ کر استعمال کیا۔ اپنی استعماری گاڑی کا پھیپہ، اپنی مرضی سے چلانے کے لیے کمپنی نے ان اینگلو انڈینز کو شے سمجھ کر استعمال کیا۔

برطانوی راج کی ترقی کی خاطر ہر مشکل اور اہم گھڑی میں اینگلو انڈین اپنے باپوں کے مفادات کے ساتھ کھڑے تھے۔ میسور کی جنگ کا موقع ہو یا مرہٹے، سکھ، افغان، گرکھا کی جنگیں ہوں، اینگلو انڈین نے ان جنگوں کو جتوانے میں برطانوی راج کی مدد کی۔

اینگلو انڈین ہندوستان میں اپنی شکل و صورت، چہرے کی رنگت، طرز بود و باش، لباس، زبان اور مشاغل سے مغربی و مشرقی کلچر کے امتزاج کے نمائندہ تھے۔ جو بچے اپنی ماؤں پہ چلے جاتے، وہ اپنی شہادت سے ہندوستانی نظر آتے، جو اپنے باپ پہ چلے جاتے وہ انگلستانی دکھائی دیتے۔ انھیں انگریزی آتی تھی تو اردو بھی؛ تاہم اُن کے لہجے سے بالخصوص مغربیت کا اظہار ہوتا۔ رقص و موسیقی میں اُن کی دل چسپی، مخصوص پیشوں میں اُن کی مہارتیں اور انگریزی زبان پر گرفت ہندوستان میں اُن کی پہچان اور انفرادیت کے پہلو تھے۔ انگریزی زبان پر اُن کی گرفت کا فائدہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کو نہیں، وقتی طور پر خود اینگلو انڈین کو بھی ہوا کہ معاشرے میں اُنھیں اس بنا پر بھی تیسرے نہیں، دوسرے درجے کے شہری مانا جاتا تھا۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ برطانوی باپوں کی اولاد ہونے کے باوجود کمپنی نے اُنھیں پہلے درجے کے شہری کا درجہ نہیں دیا؛ اُنھیں خالص یورپی نسل کا فرد نہیں سمجھا۔ اینگلو انڈین کی دوغلی حقیقت سے متعلق کمپنی، شک و شبہ کا شکار رہتی تھی۔ مثلاً اُنھیں سرکاری محکموں میں بڑے عہدے تفویض نہیں کیے جاتے تھے۔ اُنھیں ریلوے، ڈاک خانے، پولیس، کسٹم، نیوی، تدریس، نرسنگ اور چھوٹے موٹے دفتری معاملات کو نمٹانے کے لیے کلرک کی ملازمت دی جاتی تھی۔

اینگلو انڈین عورتوں اور اُن کی اولادوں کی زندگیوں میں خاص طور پر آزمائش کا وقت تب آیا جب ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ ہندوستان، ہندو، مسلمان، ان کی زبانیں اور تاریخ، ثقافتیں، سب تقسیم ہوئے تو لگ بھگ تین لاکھ اینگلو انڈین بھی، اس تقسیم سے بانداز دیگر متاثر ہوئے۔ ان میں سے کچھ صاحب حیثیت تھے، وہ ہندوستان یا پاکستان یا کسی مغربی ملک کا انتخاب کر سکتے تھے، مگر ایک بڑی تعداد ایسے اینگلو انڈین کی تھی جن کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ عزت سے ہندوستان و پاکستان میں رہتے یا کینیڈا، آسٹریلیا، انگلستان، امریکا اور نیوزی لینڈ جیسے ملکوں میں ہجرت کر جاتے۔ اُنھیں مجبوراً ہندوستان ہی میں رہنا پڑا۔ (کچھ اینگلو انڈین تقسیم کے وقت پاکستان بھی آ گئے)۔ ایک ایسے ملک میں جہاں اُن کے باپ اُن کے سر پہ نہیں تھے اور نہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، جہاں اُن کی ماؤں کا کوئی رشتہ دار اُن کے ساتھ نہیں کھڑا تھا، ان کی زندگی مشکل ہو گئی تھی۔

تقسیم کے بعد ہندوستان میں ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا تھا۔ اب فی الحال وہ اپنی زبان پر ناز نہیں کر سکتے تھے۔ اب ہندوستان میں اُن کا پہلے جیسا مقام نہیں رہا تھا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں اینگلو انڈین کی زبان پر ہی نہیں، اُن کی مذہبی شناخت پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا تھا۔ اینگلو انڈین دوسرے درجے سے اتر کر بطور اقلیت حاشیہ پہ چلے

گئے۔ پاکستان میں بھی ساٹھ اور ستر کی دہائیاں اُن پانچ چھ ہزار اینگلو انڈین کے لیے مشکل دہائیاں تھیں جو تقسیم کے بعد لاہور کے مختلف مقامات: بیڈن روڈ، مال روڈ اور گڑھی شاہو پر رہنے لگے تھے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی اردو کو ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو قومی زبان قرار دے دیا گیا تھا۔ اسلامی جمہوریہ ہونے کی وجہ سے یہاں ذوالفقار علی بھٹو نے شراب پر پابندی لگا دی۔ خلیفہ الحق کے دور میں بھی مغربی کلچر مزید پابندیوں کا شکار ہوا۔ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں ملک پاکستان جنگ، بحران اور قدامت پرستی کا شکار ہوا۔ اینگلو انڈین کو یہاں پر بھی اپنا مستقبل خطرے میں دکھائی دیا تو وہ یہاں سے بھارت، انگلینڈ، لندن اور آسٹریلیا ہجرت کرنے لگے۔

اینگلو انڈین مذہباً عیسائی تھے تو یورپی بھی تو عیسائی ہی تھے؛ لیکن اینگلو انڈین کے مذہباً عیسائی ہونے کے باوجود بھی یورپ ان کو دوسرے درجے کے شہری سمجھتا ہے تو کس لیے؟ اس لیے کہ یورپ، یورپی نسل کو ہندوستانی نسل سے برتر اور ہندوستانی نسل کو خود سے کم تر سمجھنے کی ثنویت قائم کرتا ہے۔ یہاں ہندوستانی نسل و خون کے خلاف یورپ کا تعصب اور تکبر صریحاً اپنی انتہا پر نظر آتا ہے کہ یورپ اپنے خیالات کی دنیا میں ہندوستانی نسل کو اپنے برابر قبول کرنے کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں رکھتا۔ یہی وہ افسوس کا مقام ہے کہ جہاں یورپ محض نسلی تعصب کی بنا پر انسانی مساوات کی اعلا قدر کو اپنے پاؤں میں روندتا ہے۔ یورپ کے اس انسان دشمن رویے کا نشانہ ”پورے ہندوستانی“ ہی نہیں ”آدھے ہندوستانی“ بھی بنتے ہیں۔ دنیا کے کل پانچ لاکھ اینگلو انڈین میں سے ڈیڑھ لاکھ اب بھی ہندوستان کے مختلف شہروں: بنگلور، کلکتہ، حیدرآباد، چینائی اور بمبئی میں رہ رہے ہیں۔

ایک سروے میں آدھے جوان اور آدھے ادھیڑ عمر اینگلو انڈین سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اُن کو اپنی سماجی شناخت کی بنا پر کسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تو اُن کا یہ جواب سامنے آیا:

کئی اینگلو انڈین اپنی ہندوستانی شہریت پہ خوش و مطمئن تھے اور ہندوستان سے منسلک ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے؛ جب کہ چند ایک نے اُس متعصبانہ رویے پر عدم اطمینان کا اظہار کیا جو اُن کی قومی شناخت کے پیش نظر اُن سے روار کھا جاتا تھا... ان دونوں گروہوں کے خیالات میں واضح فرق دیکھا گیا۔ ادھیڑ عمر طبقہ تو اپنی ہندوستانی شناخت کو سہولت سے قبول کرتا ہے؛ جب کہ نوجوان طبقہ اپنی شناخت کی قبولیت سے متعلق شکوک و شبہات کا شکار نظر آتا ہے۔“

اصل میں ادھیڑ عمر طبقہ، کچھ پرانا ہونے کی وجہ سے بالعموم جیسے تیسے سماج سے بھی کسی نہ کسی حد تک مطابقت قائم کر لیتا ہے؛ مگر کسی بھی خطے کا نوجوان طبقہ شروع شروع میں بالعموم اپنے ذہن سے سوچتا اور سماج میں اپنے وجود، اپنی حیثیت اور سماجی رسم و رواج کی حقیقت پر غور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں موجود اینگلو انڈین کا نوجوان طبقہ سماج میں اپنی حیثیت پر خود سے غور

کرتا ہے تو سماج کے اپنی ذات سے روارکھے جانے والے رویے کی بابت عدم اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ بہر حال تقسیم سے پہلے کی صورت حال اور تقسیم کے بعد کی صورت حال پر غور کیا جائے تو تقسیم سے پہلے اینگلو انڈین کو برطانوی راج کی وجہ سے اور ظاہر ہے ان کی ”آدھی ادھوری“ اولاد ہونے کی وجہ سے بھی سے ہندوستان میں، کام کرنے والی جگہوں پر اہمیت دی جاتی تھی؛ مگر تقسیم کے بعد انھیں ہندوستان میں قومیت اور مذہب کے مسائل کے ساتھ ساتھ سماجی، ثقافتی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

اردو افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کا ذکر تقسیم سے پہلے کے افسانہ نگاروں کے ہاں ہی ملتا ہے۔ تقسیم کے بعد، یہ طبقہ سماجی تیزی کے دکھ سے گزرا، اور اس کے بعد فراموشی کے سانچے سے۔ ابتدائی اردو افسانہ نگاروں نے تقسیم سے پہلے، اینگلو انڈین طبقے کی صورت حال کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ اگرچہ یہ طبقہ بعد میں بھی موجود رہا، مگر بعد کی نسل کے افسانے نگاروں نے ہجرت، شناخت، قوم، آمریت کے خلاف احتجاج پر زیادہ توجہ صرف کی، اور یہ طبقہ گویا افسانوی تخیل سے اوجھل ہی ہو گیا۔ اردو میں پریم چند (۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء)، غلام عباس (۱۹۰۹ء-۱۹۸۲ء)، اوپندر ناتھ اشک (۱۹۱۰ء-۱۹۹۶ء)، احمد علی (۱۹۱۰ء-۱۹۹۳ء)، سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء-۱۹۵۵ء)، کرشن چندر (۱۹۱۳ء-۱۹۷۷ء)، عصمت چغتائی (۱۹۱۵ء-۱۹۹۱ء) اور قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء-۲۰۰۷ء) کے افسانوں میں اینگلو انڈین کرداروں کا ذکر ملتا ہے؛ مگر ان تمام افسانہ نگاروں میں سے منٹو، عصمت اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں اینگلو انڈین کرداروں کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اردو میں اینگلو انڈین سے متعلق تین چار قسم کے افسانے ملتے ہیں۔ ایک وہ جن میں ہندوستانی ماؤں اور برطانوی باپوں کی اولادوں کا ذکر ملتا ہے، دوسری قسم کے افسانے وہ ہیں، جن میں اینگلو انڈین شادی شدہ جوڑوں کا ذکر ملتا ہے، اُن کی اولادوں کا نہیں۔ اردو افسانے میں مغربی و ہندوستانی کرداروں کی ایک قسم وہ بھی ہے جن کے شادی شدہ یا صاحب اولاد ہونے کا ذکر نہیں ملتا؛ تاہم اُن کرداروں کے ہندوستانی و یورپی عورتوں سے جنسی تعلقات کا کسی حد تک ذکر ملتا ہے۔ کچھ اینگلو انڈین کردار ایسے بھی ہیں جن کا کسی عورت کے ساتھ تو بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا؛ تاہم ہندوستانی عوام کے ساتھ اُن کے تعلقات کی حقیقت کو اردو افسانے نے خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ پہلے اُن افسانوں کا تجزیہ کیا جائے گا جن میں اینگلو انڈین کا ذکر بالخصوص کسی اینگلو انڈین جوڑے کی اولاد کے طور پر ملتا ہے؛ دوسرے حصے میں اُن افسانوں کا تجزیہ، جن میں محض اینگلو انڈین میاں بیوی کا ذکر ملتا ہے؛ جب کہ تیسرے حصے میں اینگلو کرداروں کے عوام کے ساتھ تعامل کا مختصر سا جائزہ لیا جائے گا۔

غلام عباس کے مشہور افسانہ ”اور کوٹ“ میں تین اینگلو انڈین لڑکیوں کا ذکر آیا ہے؛ مگر ضمنی کرداروں کے طور پر۔ افسانے میں یہ تینوں لڑکیاں ایک سینما کے برآمدے میں، بورڈوں پر، آنے والی فلموں کی تصویریں دیکھتی، ایک فلم پر رائے زنی

کرتیں اور افسانے کے مرکزی کردار (نوجوان لڑکا) کا مذاق اڑاتی سینما سے باہر نکلتی دکھائی گئی ہیں۔ افسانے میں ان تینوں لڑکیوں کا نام نہیں آیا، ہاں مگر ان کی جوانی اور حسن کا ذکر ضرور آیا ہے:

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ اتنے میں ایک لڑکی نے، جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ دوسری لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔^{۱۳}

غلام عباس ہی کے افسانے ”سیاہ سفید“ میں بھی اینگلو انڈین مردوزن کا ذکر ذیلی کرداروں کے طور پر آیا ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار میمونہ ایک تہوہ خانہ میں اینگلو انڈین اور یورپین مردوزن کے لباس کو دیکھتی ہے تو ان کا لباس اُس کی توجہ کھینچتا ہے؛ گویا اس افسانے میں اینگلو انڈین کا ذکر محض اُن کے لباس کی کشش کے تناظر میں ہوا ہے۔

ہندوستانی، اینگلو انڈین اور یورپین مردوزن بڑھیا سے بڑھیا لباس پہنے مزے مزے سے تہوہ پی رہے تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ وہ جوں جوں انھیں دیکھتی گئی اس کی دل چسپی بڑھتی چلی گئی^{۱۴}۔

اینگلو انڈین کی ایک پہچان اُن کا اعلا قسم کا یورپی لباس بھی تھا۔ غلام عباس کے اس افسانے میں بھی اینگلو انڈین کے اول درجے کے لباس کا ذکر آیا ہے۔ افسانہ ”اوور کوٹ“ کی تینوں اینگلو انڈین لڑکیاں آوارہ لڑکیوں کے طور پر دکھائی دیتی ہیں؛ جب کہ افسانہ ”سیاہ سفید“ کے اینگلو انڈین مردوزن لباس تو عمدہ پہنے ہوئے ہیں؛ مگر وہ اس تہوہ خانے میں تہوہ پہنے آئے تھے کہ جہاں چیزوں کے دام بہت کم لیے جاتے تھے۔ غلام عباس کے دونوں افسانوں میں اینگلو انڈین کردار ضمنی کرداروں کے طور پر اس لیے نظر آتے ہیں کہ وہ سماج میں بھی مرکزی مقام سے محروم ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”جن بولو تار اتارا“ میں ایک اینگلو انڈین لڑکی رینی اسمتھ کا ذکر ضمناً فلم کی ہیروئن کے طور پر آیا ہے؛ جب کہ اسی افسانے میں کلکتہ اور بمبئی کے اینگلو انڈین محلوں کا ذکر بھی ضمنی طور پر ہی آیا ہے۔ تاہم ان کے دیگر افسانوں میں انھیں مرکزی کردار بھی بنایا گیا ہے، جس کا ذکر آگے ہے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانے ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ میں بھی یورپین وارڈ میں موجود دو اینگلو انڈین پاگلوں کا ذکر محض ثانوی کرداروں کے طور پر ملتا ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں اُن کی نفسیاتی صورتِ حال کو منٹو نے اس طرح بیان کیا ہے:

ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا ڈ

جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے چپاتی زہر مار نہیں کرنی پڑے گی؟^{۱۵}

انگریز ہندوستان کو تقسیم کر کے انگلستان واپس چلے گئے تو یورپین وارڈ میں اینگلو انڈین پاگلوں کی، اپنی صحت، خوراک اور سماجی شناخت کے حوالے سے فکر مندی قابل فہم ہے۔ اینگلو انڈین پاگلوں کی فکر مندی محض تصوراتی نہیں؛ حقیقی حالات کی پروردہ ہے۔ افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کی تشویش کے اگرچہ کئی اسباب ظاہر ہوئے ہیں؛ مگر ان کرداروں کے ذہن میں ان کی سب سے بڑی پریشانی کی وجہ ان کا اینگلو انڈین ہونا ہے۔ وہ پاگل خانے میں اپنے پورے یورپی یا پورے ہندوستانی ہونے کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ یہاں اپنے آدھے یورپی اور آدھے ہندوستانی ہونے کی شناخت پر کڑھتے ہیں۔ ہندوستان میں اینگلو انڈین کی تعداد پہلے ہی بہت کم ہے؛ اس پر مستزاد پاگل خانے میں بھی وہ صرف دو اینگلو انڈین ہیں۔ ہندوستان میں اینگلو انڈین کے والدین عام طور پر اپنی نارمل، صحت مند اولادوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے تو تقسیم کر کے اس نازک موڑ پر اپنی پاگل اولادوں کی فکر کون کرے گا؟ پاگل خانے سے باہر یا پاگل خانے کے اندر ان دونوں کے بارے میں کون سوچے گا؟ اگر ان کی طرف کوئی دیکھے گا بھی تو کون دیکھے گا؟ کوئی ہندوستانی؟ یا کوئی انگلستانی؟ کوئی ہندوستانی یا کوئی انگلستانی دیکھے گا بھی تو کس سوچ اور کن نگاہوں سے دیکھے گا؟ کسی ہندوستانی کی نظر ان پر پڑے گی تو وہ ان کی شناخت کے پیش نظر انھیں آدھا دشمن جانے گا، کسی انگلستانی کی نظر پڑے گی تو وہ اپنے غلام ملک کے پاگل خانے میں موجود ان دو اینگلو انڈین کو کیا وقعت دے گا؟ یہ سب سوالات و خیالات یورپین وارڈ میں موجود دو پاگل اینگلو انڈین کے ذہنوں کے اندر عجیب نفسیاتی کھنچاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ یہ دونوں اینگلو انڈین پاگل اپنی شناخت کے معاملے کو لے کر ہر طرف سے خطرہ ہی خطرہ، مایوسی ہی مایوسی محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ان کے اندر چلنے والے خیالات پر، بطور انسان کے، ان کی ذات پر توجہ نہیں دیتا؛ ہاں مگر سعادت حسن منٹو بطور حقیقی انسان دوست فنکار کے، منٹو کا کمال یہ ہے کہ اس نے اینگلو انڈین کرداروں کی اس اصل پریشانی؛ یعنی شناخت کے بحر ان کو اپنے افسانے ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ میں زبان دی ہے۔

منٹو کے افسانے ”مہربھائی“ میں بھی اینگلو انڈین عورتوں کا ذکر بیسوا کی حیثیت سے اور محض جزوی کرداروں کے طور پر آیا ہے:

فارس روڈ یوں تو ایک سڑک کا نام ہے لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوا کی بستی ہیں۔۔۔ یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی، جاپانی، غرض یہ کہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے^{۱۶}۔

منٹو کے افسانے ”شادی“ میں ایک دفتر میں کام کرتی ہوئی اینگلو انڈین لڑکی کا ذکر صرف اُس کے جسمانی خطوط کی ذیل میں ہوا ہے:

کرے میں داخل ہوتے ہی چوہی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر

آئی جس کی چھتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔^{۱۷}

منٹو کے افسانے ”بو“ میں بمبئی کی عیسائی لڑکیوں کا ذکر ان کے بازاری اور رقصہ ہونے کے تناظر میں؛ نیز جنگ کے زمانے میں ان کے اگزالری فورس میں بھرتی ہونے کے تناظر میں ہوا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار رندھیر ایک عیسائی لڑکی ہیزل سے اُس کی رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر ہی ایک گھٹا لڑکی سے جسمانی تعلق قائم کرتا ہے۔

جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھو کر یاں جو پہلے سستے دامنوں پر مل جاتی تھیں، عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی^{۱۸}۔

منٹو کے افسانے: ”ممی“ میں چھ اینگلو انڈین لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے؛ مگر صرف جنسی چیز کے طور پر۔

ممی چمکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط والوان کی۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلم اور تھیلما^{۱۹}۔

مذکورہ پانچ اینگلو انڈین لڑکیوں کے علاوہ چھٹا کردار بھی ایک چودہ پندرہ سالہ اینگلو انڈین لڑکی ہی کا ہے۔ فی لس اپنے گھر سے فرار ہے، جسے افسانے کے تمام مردانہ کردار چڑھ، دن کترے، رنجیت کمار اور غریب نواز حریص نگاہوں سے دیکھتے ہیں، سب اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، خاص طور پر چڑھ؛ مگر ممی (نائید) کے دل میں موجود انسانیت کے جذبات کی بنا پر محروم رہتے ہیں۔ یہ تمام مردانہ اینگلو انڈین لڑکیوں کے عاشق، گاہک اور دوست ہونے کا کردار نبھاتے ہیں۔ ان تمام اینگلو انڈین لڑکیوں کا ممی (سزسٹیلہ جیکسن) کے پاس ہونا ان سب لڑکیوں کے والدین سے متعلق یہ سوال سامنے لاتا ہے کہ وہ کہاں ہیں؟ انھوں نے اپنی بیٹیوں پر اتنی سی توجہ کیوں نہ دی کہ وہ ان کے پاس رہ پائیں۔ فی لس اپنے والدین ہونے کے باوجود گھر سے انھی اینگلو انڈین لڑکیوں کے پاس کیوں آجاتی ہے جو ممی کے پاس موجود تھیں؟ فی لس گھر سے کیوں بھاگتی ہے؟ یہ سب لڑکیاں ممی کے گھر (سعیدہ کونج) ہی میں کیوں ٹھہرتی ہیں؟ قومی امکان ہے کہ ان پانچ لڑکیوں کے ماں یا باپ میں سے بھی کوئی نہ کوئی ضرور زندہ ہو مگر کسی ایک نے بھی ان کی ذمہ داری اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی ہو۔

منٹو کے افسانے ”مجید کا ماضی“ میں بھی اینگلو انڈین عورتوں اور لڑکیوں کا ذکر ان کے جنسی خطوط: نیکی ناک، نیکی ناگلوں، چھتیاں اور لباس: اسکرٹ کے تناظر میں ہوا ہے۔ مجید افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ افسانہ مجید کی ماضی کی یادوں کی روداد پر مبنی ہے کہ ماضی بعید میں، یعنی حال سے پندرہ برس پہلے، مجید بظاہر موجودہ آسائشوں: گھر، پیسوں اور عورتوں سے محروم تھا مگر وہ تب

چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مل جانے پر اندر سے بہت خوش ہو جایا کرتا تھا۔ اسی لیے وہ اب، فرصت کے لمحوں میں، وہسکی پی کر، اپنے حال کی حقیقت سے بے ساختہ ماضی میں، جنگ سے پہلے کے زمانے میں چلا جاتا ہے اور اُس زمانے کو یاد کرتے ہوئے اُس زمانے کا حال سے موازنہ کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ماضی میں اپالو بندر پہنچ کر وہ یہودی، تیکھی ناک والی اینگلو انڈین اور یورپی عورتوں کو اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھ کر ہی جو خوشی محسوس کرتا تھا وہ موجودہ زندگی میں کئی عورتوں سے جنسی مراسم قائم کر کے بھی حاصل نہیں کر پاتا۔ مجید اینگلو انڈین عورتوں اور لڑکیوں کو ایک نہیں، دو تین چار یاد کرتا ہے۔ پہلے موقع پر وہ انہیں اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھ کر خوشی کے احساس کو یاد کرتا ہے۔ دوسری یاد میں وہ دادر اسٹیشن پر پل کے نیچے کھڑے ہو کر، اسکرٹ پہنے اینگلو انڈین لڑکیوں کو اوپر چڑھتے دیکھتا اور اپنی نظر کو خاص طور پر اُن کی ننگی ٹانگیں دیکھنے پر جماتا ہے۔ تیسری یاد میں وہ پھر سوچتا ہے کہ آج رقص و سرود کی محفلوں میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا جو کبھی اینگلو انڈین لڑکیوں کی ننگی متحرک ٹانگیں دیکھ کر ہوتا تھا۔ چوتھی یاد کا تعلق بھی ایک بوڑھی یہودن، مس لینا اور اُس کی دو جوان بیٹیوں اہستھر اور ہیلن کے ساتھ گزارے وقت کے ساتھ ہے۔ مس لینا کی کھولی میں، اُس کی بیٹیوں کے جنسی اعضا (آڈو آڈو جتنی چھاتیوں اور ننگی ٹانگوں) کو دیکھ کر وہ اپنے دماغ میں جو فرحت محسوس کرتا ہے، وہ اُس فرحت کے احساس کو خاص طور پر یاد کرتا ہے۔

منٹو کے افسانے ”والد صاحب“ میں ایک اینگلو انڈین لڑکی مارگریٹ، لاہور کے ایک ہسپتال میں بطور نرس نظر آتی ہے۔ منٹو کا یہ افسانہ ۲ جون ۱۹۵۰ء کو؛ یعنی تقسیم کے بعد شائع ہوا۔ مارگریٹ اس افسانے کا اگرچہ مرکزی کردار ہے مگر باقی کرداروں: توفیق اور اُس کے والد اور اُس کے دوستوں کے لیے کسی نہ کسی شکل میں صرف جنسی حظ اٹھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ مارگریٹ توفیق کے والد صاحب (ڈی ایس پی) کے وارڈ میں اُس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ توفیق بھی اپنے والد کی تیمارداری کے لیے وارڈ میں روز آتا ہے۔ اسی وارڈ میں توفیق مارگریٹ کی خوب صورتی سے متاثر ہو کے اُسے پھنسا لیتا ہے۔ وہ اُس سے ایک بار سینما میں ملتا ہے اور دوسری بار کہیں دور دراز لمبی ملاقات کرنے کا معاملہ طے کر لیتا ہے۔ وہ مقررہ دن، مقررہ جگہ پہ مارگریٹ کو لے جانے کے لیے ہسپتال آتا ہے۔ وارڈ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا باپ اُس سے بوس و کنار میں مصروف تھا۔

جمیل اور ریاض دونوں بہ یک وقت بولے، ”کیا دیکھتا ہے؟۔۔۔ نصیر تھوڑی دیر کے لیے رکا، ”میں توفی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مارگریٹ پانگ پر جھکی ہوئی ہے اور والد صاحب۔۔۔ اور والد صاحب اس کے ہونٹ چوس رہے ہیں۔“

توفیق مارگریٹ کو دیکھ کے، اُس سے باتیں کر کے، اُس سے سینما میں مل کے، لمبی ملاقات کا منصوبہ بنا کے اُس کے جسم کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ توفیق کے والد صاحب پہلے ہی اس اینگلو انڈین لڑکی پر خاص نظر رکھے ہوئے تھے اور توفیق کے تمام دوست بھی

مارگریٹ کے بارے میں محض تلمذ آمیز باتیں کرتے ہیں:

یہ دھن جو تم بجار ہے ہو رشید عطرے کی ہے۔ اور رشید عطرے کی کوئی دھن سن کر آج تک کوئی اینگلو انڈین یا کر سچین نرس بے ہوش نہیں ہوئی۔ بہتر ہو گا اگر تم رومال پر تھوڑا سا کلوروفارم چھڑک کر لے جاؤ!۔

اردو افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کی نمائندگی کو دیکھا جائے تو باقی افسانہ نگاروں کی نسبت منٹو کے افسانوں میں اینگلو انڈین کرداروں کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ منٹو کے ہاں اینگلو انڈین کردار ضمنی ہی نہیں مرکزی کرداروں کے طور پر بھی نظر آتے ہیں؛ مگر منٹو کے افسانوں میں اینگلو انڈین کردار اکثر طوائف ہی نظر آتی ہیں۔ سوال یہ ہیں کہ منٹو نے سب سے زیادہ اینگلو انڈین کرداروں پر کیوں لکھا اور منٹو کی مرکزی کردار اکثر طوائف ہی کیوں ہیں؟ دراصل منٹو عام، بظاہر نارمل، صحت مند، سماجی سانچوں میں پوری طرح ڈھل جانے والے، معاشرے کے ساتھ پوری طرح مطابقت قائم کر لینے والے کرداروں میں کشش محسوس نہیں کرتا۔ منٹو کی توجہ کا مرکز بالعموم انوکھے اور حاشیائی کردار بنتے ہیں۔ اینگلو انڈین طبقہ ہندوستان کا انوکھا اور مختلف سماجی شناخت کا حامل ایک طبقہ تھا۔ یہ طبقہ ہندوستان میں نہ صرف اقلیتی طبقہ تھا؛ بلکہ اس طبقے کی عورتیں بھی حاشیے پر نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں پہلو؛ یعنی اینگلو انڈین طبقے کا ایک مختلف سماجی شناخت کا حامل طبقہ ہونا اور پھر اس طبقے کی عورتوں کا عام عورتوں کی نسبت زیادہ مشکل میں ہونا، منٹو کی ان دونوں پہلوؤں پر خاص نظر رہی۔ مجموعی طور پر بھی منٹو انھی کرداروں کو اپنے افسانوں کے مرکزی کردار بناتے ہیں جنہیں اشرافیہ طبقہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بقول ناصر عباس تیز:

منٹو ان کرداروں کو اپنے افسانوں کے کبیری کردار بناتے ہیں جنہیں سماج کی اشرافیہ دھتکارتی ہے اور ان کے وجود ہی کو فحش سمجھتی ہے^{۲۲}۔

منٹو کے افسانوں: ”مجید کا ماضی“، ”بو“ اور ”ممد بھائی“ کی اینگلو انڈین عورتوں کا تعلق بمبئی سے ہے تو عصمت چغتائی کے افسانے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کے اینگلو انڈین جوڑے کا تعلق بھی بمبئی سے ہے۔

عصمت چغتائی کا افسانہ: ”ہندوستان چھوڑ دو“ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کی یاد بھی دلاتا ہے کہ اس تحریک کا آغاز ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی نے برطانوی راج کے خلاف کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو فوری طور پر چھوڑ دیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک انگریز ہندوستان اس لیے نہیں چھوڑ پاتا کہ وہ اپنی نوکرانی کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اور ہندوستان کی نسبت انگلستان میں اُسے کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔

اس افسانے میں ایک اینگلو انڈین جوڑے کا ذکر مرکزی کرداروں کے طور پر، جب کہ اُن کی اولاد کا ذکر ضمنی کرداروں

کے طور پر ملتا ہے۔

افسانے کا کبیری کردار ایرک ولیم جیکسن شادی شدہ ہے، جو خود تو ہندوستان میں رہ رہا ہے؛ مگر اُس کی بیوی ڈار تھی انگلستان میں اپنی دو بیٹیوں استھر اور لڈا کے ساتھ رہتی ہے۔ ڈار تھی چھٹیوں میں دو ماہ کے لیے ہندوستان کے شہر بمبئی آتی ہے اور یہاں کے ماحول سے تنگ آکر جلد ہی انگلستان واپس چلی جاتی ہے۔ ڈار تھی کی عدم موجودگی میں ایرک ولیم جیکسن اپنے بچوں استھر اور لڈا کی آیا کا ہاتھ بٹانے والی سکھو بائی (نوکرانی) سے جنسی تعلقات قائم کرتا ہے۔ سکھو بائی کی جنسی زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایرک ولیم جیکسن ہی کی نہیں، ایک ہندوستانی شادی شدہ، بال بچوں والے مرد کنپٹ بیرے کی بھی رکھیل تھی۔ رفتہ رفتہ سکھو بائی، ولیم جیکسن سے بیوی کی عوضی بھی بھگتنے لگتی ہے۔ ان دونوں کے ہاں دو بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پٹو اسی اور فلومینا۔ افسانے میں ان اینگلو انڈین بچوں سے متعلق چند حقیقتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک حقیقت یہ کہ یہ بچے یتیم خانے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسری حقیقت یہ کہ ان کا باپ ایرک ولیم جیکسن اپنی انگریز بیوی ڈار تھی سے پیدا ہونے والے بچوں استھر اور لڈا کی نسبت ان اینگلو انڈین بچوں کو زیادہ یاد کرتا ہے۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جیکسن اپنی بیوی ڈار تھی کو ناپسند کرتا ہے اس لیے اُس کے بچوں کے ساتھ بھی اُس کا تعلق پھل پھول نہیں پاتا، مگر دوسری طرف سکھو بائی اُسے بہت پیار دیتی ہے اس لیے اُس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچوں کے ساتھ وہ وقت گزارنا چاہتا ہے؛ مگر جیکسن کے خیال میں وہ یہ وقت اس لیے نہیں گزار پاتا کہ شام کو فلومینا دیر سے آتی ہے اور پٹو بھی دن بھر لوٹوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ تیسری حقیقت ان اینگلو انڈین بچوں سے متعلق یہ سامنے آتی ہے کہ جیکسن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شراب پی کے کھولی کے آگے لینا ہوتا ہے اور فلومینا اور پٹو اُس کی صحت کی پروا کیے بغیر اُس کے اوپر سے گزر جاتے ہیں؛ گویا اُن کا اپنے باپ کے ساتھ جیسے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے دل میں باپ کے لیے کوئی عزت محسوس نہیں کرتے؛ بلکہ وہ بطور انسان بھی اُس کی کوئی پروا نہیں کر پاتے۔ فلومینا اور پٹو کا باپ سے متعلق یہ لاپرواہی و بے حسی کارویہ قابل توجہ ہے۔ اس رویے کی تہ میں غیر ذمہ دار باپ کے لیے غصے، نفرت اور انتقام کے جذبات پوشیدہ ہیں۔

افسانے کی راوی اس افسانے میں برطانوی مردوں کے مقامی عورتوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور ان تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اینگلو انڈین بچوں کے ظاہری حلیے، خدو خال، چہرے کی رنگت اور ہندوستان میں اُن کی سماجی و معاشی حیثیت کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتی ہیں:

صاحب لوگ ویسے اپنا کام بیٹو عورتوں سے چلا لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ حساب بھی سست رہتا تھا۔ ہندوستان کا بھی فائدہ تھا۔ اس میں ایک تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد بادامی اور کبھی خاصی گوری پیدا ہوتی تھی اور پھر ان کے بار سوخ باپ ان کے لیے یتیم خانے اور اسکول بھی کھول دیتے

تھے۔ سرکاری خرچہ پر ان کی دوسرے ہندوستانیوں سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ اینگلو انڈین خوش شکل طبقہ انگریزوں سے بس دوسرے نمبر پر تھا۔ لڑکے ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے جو معمولی شکل کی لڑکیاں ہوتیں انھیں ہندوستانی لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر نوکریاں مل جاتیں اور وہ سکولوں، دفنوں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں۔ جو زیادہ حسین ہوتیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازار حسن میں بڑی کامیاب ثابت ہوتیں ۲۳۔

مذکورہ اقتباس میں عصمت بہ یک وقت تاریخی اور حقیقی تناظر میں اینگلو انڈین طبقے کی صورتِ حال کو واضح کرتی ہیں۔

عصمت چغتائی کے افسانے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے اُن کے چند افسانے خاص طور پر منٹو کے افسانوی موضوعات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ مثلاً منٹو کے افسانے ”ممی“ کی طرح عصمت کے افسانے ”سوری ممی“ کی مرکزی کردار بھی ممی (سز چل) ہے۔ دونوں افسانوں کی عورتیں انگریز ہیں۔ دونوں بہ یک وقت اینگلو انڈین لڑکیوں کی ماہیں اور نانیکہ ہیں۔ دونوں افسانوں میں ان اینگلو انڈین لڑکیوں کا ایک نہیں، بار بار ذکر محض اُن کے لباس، حسن، اور ایک بازار کی جنس کے طور پر آیا ہے۔ دونوں افسانوں میں ممی کا کردار ایک طرح سے مثبت کردار ہے۔ عصمت کے افسانے میں بھی ممی ان اینگلو انڈین لڑکیوں کی خیر خواہ ممی ہے؛ بہر حال یہ مماثلتیں اپنی جگہ؛ مگر عصمت چغتائی بطور راوی اپنے افسانوں میں اینگلو انڈین لڑکیوں کی سماجی حیثیت کو منٹو کی نسبت زیادہ نمایاں کرتی ہیں۔ منٹو کے زیادہ افسانوں میں اینگلو انڈین لڑکیوں کا ذکر ایک ایک دو جملوں تک محدود رہتا ہے؛ مگر عصمت نہ صرف مذکورہ افسانے میں ایک اینگلو انڈین خاندان سے متعلقہ کئی حقائق کو سامنے لاتے ہیں؛ بلکہ اس افسانے میں بھی وہ اس طبقے کی سماجی حقیقت کے بارے میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتیں اور انگریزوں کو اس طبقے کی گئی گزری حالت کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں:

شہر بھر کی قبول صورت اینگلو انڈین لڑکیوں کی وہ لاڈلی ممی تھی۔ فلم میں کام کرنے کے شوقین نوجوان پونا کر اسی کے ہنگلے کارخ کرتے کیوں کہ وہاں بڑے بڑے بمبئی اور پونا کے پروڈیوسر شام کو جمع ہوا کرتے تھے۔ ریس کے رسیا، چھوٹے چھوٹے راجہ، جنگ کے زمانے میں کمائی ہوئی اندھا دھند دولت کو چوگنا کرنے کے شوقین نو دولیتے اور ان کے دولت کو ٹھکانے لگانے والے ملدھ۔ سب ہی کو وہاں سے فیض ملتا تھا اور ممی کی لڑکیاں نہایت کلچر ڈاور حسین تھیں ۲۳۔

ممی کو آزادی سے اس شریفوں کی ہستی میں دھندا کرنے کی اجازت صرف اس لیے ملی ہوئی تھی کہ اس کی کلائنٹس سب اینگلو انڈین تھیں جو دیس کی لاج نہیں سمجھی جاتیں۔ شاید اس لیے کہ وہ قابلِ نفرت سفید قوم کی گھناؤنی حماقتیں تھیں۔ ساری یا غارے میں اس کے ہاں کسی حسینہ کو نہیں دیکھا گیا۔ اس معاملے میں وہ بڑی

سخت تھی۔ اس کی پارٹیوں میں شرکت کے لیے لازمی تھا کہ فراک، اسکرٹ یا جمین پہنی جائے۔ گھریلو جھاڑ
جھکار بیویوں سے آتے ہوئے اصحاب کو مسالہ بھی چھپٹا اور مختلف ڈالنے کا ملتا ۲۵۔

اینگلو انڈین کرداروں کے ضمن میں منٹو اور عصمت کے اور بھی ایسے افسانے ہیں جن میں فکری سطح پر گہری مماثلتیں

ہیں۔ (چند ایک کا ذکر آگے آئے گا۔)

منٹو اور عصمت کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے اینگلو انڈین کرداروں کو اپنے فکشن کا موضوع بنایا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”ڈالن والا“ میں دو اینگلو انڈین کرداروں کا ذکر معمولی کرداروں کے طور پر ملتا ہے۔ ایک
باپ: مسٹر جارج بیگٹ اور دوسرا کردار اُس کی اکلوتی بیٹی: ڈائنا کا کردار۔ دونوں کی سماجی و معاشی حالت قابل ترس ہے۔ باپ، بیٹی کے
کمائے ہوئے تھوڑے سے پیسوں پر گزارا کرتا ہے۔ ڈائنا پہلے سینما میں ماہانہ چھپیس روپیہ کے عوض ٹکٹ بیچنے کا کام کرتی ہے۔ اتنی
تھوڑی رقم سے باپ بیٹی کا گزارا نہیں ہو پاتا تو بیٹی ماہانہ چھپتر روپیہ کے عوض سرکس میں نوکری کرنا شروع کر دیتی ہے۔
سرکس کی یہ نوکری ہی ڈائنا کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ راوی کی زبانی ہندوستان کے شہر ڈالن والا کے ان دونوں کرداروں کی
صورت حال درج ذیل اقتباسات میں دیکھیے:

مسٹر جارج بیگٹ ایک بے حد فاقہ زدہ اینگلو انڈین تھے۔ وہ پلپلی صاحب کہلاتے تھے۔ وہ سڑک کے سرے پر
ایک خستہ حال کائی آلود کٹنچ میں رہتے تھے اور بالٹی اٹھا کر صبح کو میونسپلٹی کے نل پر خود پانی بھرنے جایا کرتے
تھے۔ ان کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈائنا تھا، وہ پریڈر گراؤنڈ پر ایک انگریزی سینما ہال میں ٹکٹ بیچتی تھی اور
خوش رنگ فراک پہنے اکثر سامنے سے سائیکل پر گزارا کرتی تھی۔ اس کے پاس صرف چار فراک تھے جنہیں وہ
دھودھو کر اور بدل بدل کر پہنا کرتی تھی ۲۶۔

اس خوش حال اور مطمئن انگریزی محلے کے واحد مفلس اور اینگلو انڈین باسی کبھی کبھی نیلی آنکھوں والے مسٹر
جارج بیگٹ تھے مگر وہ بڑی آن بان والے اینگلو انڈین تھے اور خود کو پکا انگریز سمجھتے تھے۔۔۔ لیکن بچے بہت بے
رحم ہوتے ہیں۔ ڈالن والا کے سارے ہندوستانی بچے مسٹر جارج بیگٹ کو نہ صرف پلپلی صاحب کہتے تھے بلکہ کملا
اور وملاکے بڑے بھائی سورن نے جو ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا اور ڈون پبلک اسکول میں پڑھتا تھا، مسٹر بیگٹ کی
لڑکی ڈائنا کو چڑانے کی ایک اور ترکیب نکالی تھی ۲۷۔

محلے کے بچے، باپ اور بیٹی دونوں کو تنگ کرتے ہیں۔ بچے ڈائنا کے باپ مسٹر بیگٹ کو پلپلی صاحب کہہ کر چڑاتے اور ڈائنا کو

ایک مخصوص گیت سنا کر۔ راہ گیر ڈانٹا کے اچھے کپڑے دیکھ کر اُسے شک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اُس کے بارے میں یہ خیال قائم کرتے ہیں کہ گورے ڈانٹا کو پیسے دیتے ہیں؛ جب کہ بیان کنندہ اس شک کی تردید کرتی اور یہ نقطہ نظر ظاہر کرتی ہے کہ اگر گورے ڈانٹا کو واقعی میں پیسے دیتے تو اُسے نوکریاں نہ کرنا پڑتیں۔ اس کی معاشی حالت اتنی بہتر ہوتی کہ وہ اپنی فراکوں کی تعداد میں اضافہ کر پاتی۔ اصل میں اینگلو انڈین لڑکیاں لباس ہی اس طرز کا پہنتی تھیں کہ اس میں ہندوستانی لڑکوں کے لیے جاذبیت کا پہلو ہوتا تھا۔

ڈانٹا بطور بیٹی، ایک محنتی اور سلیجھی ہوئی انسان کے طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے باپ کی غربت اور تکلیف کو دیکھ کر اوڈین سینما کی نوکری چھوڑ کر سرکس میں نوکری شروع کرتی ہے تو یہی سرکس کی نوکری ہی اُسے مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ سرکس میں کنویں کی دیوار پر موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گر پڑتی ہے اور اُس کی دونوں ٹانگیں چنچا چور ہو جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے مقامی اینگلو انڈین عورتوں ہی کو اپنے افسانوں میں جگہ نہیں دی، غیر مقامی اینگلو انڈین عورتوں کی زندگی کے مسائل کو بھی غیر جانب داری سے محسوس کیا۔ مثلاً ان کے افسانے ”یاد کی اک دھنک جلمے“ میں ایک یتیم، لیسیر اور بیوہ اینگلو انڈین خاتون گرہیسی کا ذکر بنیادی کردار کے طور پر ملتا ہے۔ گرہیسی کا پہلا شوہر انگریز تھا۔ شادی کے تیسرے سال، بیس برس کی عمر میں گرہیسی بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس کی پہلی شادی پسند کی تھی۔ وہ اپنے شوہر جوزف سے محبت کرتی تھی۔ اُس کے انتقال کے بعد وہ دس برس در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ پھر اُسے بمبئی میں ایک ایسا گھرانہ نصیب ہوتا ہے، جس میں وہ کئی برس ایک دیانت دار نوکرانی کی حیثیت سے زندگی گزارتی ہے۔ گرہیسی، افسانے کی بیان کنندہ کے چچا ناصر کے گھر میں ایک مخلص نوکرانی کا کردار نبھاتی ہے۔ اُس کے کردار سے متاثر ہو کر ہی چچا ناصر اپنی بیوی سعیدہ کے انتقال کے بعد اُس سے شادی کر لیتے ہیں؛ مگر گرہیسی کی قسمت کہ شادی کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس کے ہندوستانی شوہر کا بھی انتقال ہو جاتا ہے اور گرہیسی جو پاکستان بننے کے ڈیڑھ برس بعد اپنے شوہر ناصر کے ساتھ لاہور آگئی تھی، پھر تنہا رہ جاتی ہے۔

گرہیسی چچی اس وقت جانے کہاں ہوں گی۔ اس بڑھاپے میں کیا بمبئی میں کہیں آیا گیری کر رہی ہوں گی؟^{۲۸}

افسانے میں گرہیسی کے ماں باپ اور بھائی کی وفات کا ذکر ملتا ہے؛ مگر اس حقیقت کا تذکرہ نہیں ملتا کہ اُس کے ماں یا باپ نے کسی مقامی مرد یا عورت سے شادی کی تھی یا نہیں؛ تاہم گرہیسی کی ایک انگریز سے شادی کی بنا پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ گرہیسی کے والدین پور پورین ہی ہوں مگر اُن کی اور اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ ہندوستان میں محض آیا گیری کے قابل رہ جاتی ہے۔ اردو افسانے میں گرہیسی بطور اینگلو انڈین دوسرا کردار ہے جس کے تقسیم کے بعد پاکستان کے شہر لاہور میں رہنے کا ذکر ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”در تیچ کے سامنے“ میں بھی اینگلو انڈین لڑکیوں کا ذکر ادنیٰ کرداروں کے طور پر آتا ہے۔ اس

افسانے کی مرکزی کردار بیان کنندہ ہے۔ بیان کنندہ افسانے میں ہمہ بین (Omniscient) کا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ اپنے کمرے کے درمیان کھڑی ہو کر سامنے کی سڑک کو دیکھنے کا تجربہ لکھتی ہے۔ اُسے سڑک پر گزرتے ہوئے کئی لوگ دکھائی دیتی ہیں۔ انھی لوگوں میں کچھ جوان اینگلو انڈین لڑکیاں بھی ہیں جو صبح کو اپنے سائیکلوں پر دفتر جاتی ہیں اور شام کو دفتر سے واپسی پر اپنے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک کی تہہ کو مزید موٹا کرتے ہوئے کنٹ پلئیس یا انڈیا گیٹ جاتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر جوان لڑکے کیارڈ عمل ظاہر کرتے ہیں؟ بیان کنندہ نہ صرف اُن کے ردّ عمل کو؛ بلکہ اس ردّ عمل پر لڑکیوں کے ردّ عمل کو بھی دیکھتی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ ہر روز تیسرے پہر کو، اسی سڑک کے موڑ پر ایک پچیس سالہ اینگلو انڈین لڑکی ایک نئے آدمی کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے۔ اس افسانے کی تمام اینگلو انڈین لڑکیاں بھی بازار کی ایک شے کے طور پر نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کے جوان لڑکے سیٹیاں بجاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”شربت والی گلی“ میں ایک اینگلو انڈین ماں ڈولی جیکب اور اُس کی بیٹی مس جوہی مرکزی کردار کے طور پر نظر آتی ہیں۔ دونوں ماں بیٹی اپنے اپنے زمانے کی فلمی ایکٹریس ہیں۔ ڈولی جیکب فلمی دنیا میں جب اپنے عروج پہ تھی تو دلی کے ایک رئیس دیوان راج ناتھ نے یہ کہہ کر اُس سے شادی کر لی تھی کہ اُسے ڈولی کے ماضی سے نہیں، مستقبل سے دل چسپی ہے۔ دیوان راج ناتھ ڈولی کو شنگ کی بنا پر گھر سے باہر نکال دیتے ہیں اور پھر ڈولی جیکب کی اگلی زندگی کسمپرسی کی حالت میں گزرتی ہے۔ وہ اپنی ہی بیٹی جوہی کو اغوا کر کے اپنے شوہر دیوان سے بیس ہزار روپیہ نکلوانے کے منصوبے میں ملوث ہوتی ہے۔ افسانے میں دونوں ماں بیٹی ایک تو اینگلو انڈین ہیں اور دوسرا فلمی ایکٹریس ہیں۔ اس معاشرے میں اینگلو انڈین عورتوں اور پھر اس پر مستزاد فلمی ایکٹریس کی کیا حیثیت تھی؟ اس سوال کا جواب ڈولی جیکب کی زبان سنئے:

آج سے چالیس سال پہلے نئی نئی ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اینگلو انڈین اور یہودی لڑکیوں کا بول بالا تھا، جو زیادہ تر سماج کے ”بے عزت طبقے“ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ڈولی جیکب لنبانی یہودن تھیں۔ اس کے ماں باپ اسی شربت والی گلی میں رہتے تھے۔ باپ پرانے کپڑوں کا بیوپار کرتا تھا وہ غریب لوگ تھے۔ مگر ڈولی اپنے حسن کی بدولت فلمی دنیا میں پہنچ گئی۔۔۔ فلم ایکٹریسوں کو سوسائٹی میں بے حد ذلیل سمجھا جاتا تھا^{۲۹}۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”تار پر چلنے والی“ میں اُن اینگلو انڈین لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے جو سرکس میں کام کرتی اور مشکل سے زندگی بسر کرتی ہیں، مگر افسانے میں ان مختلف اینگلو انڈین لڑکیوں میں سے بالخصوص مس لارا (جس کا پرانا نام کیتھیرن دوپاں تھا) کے کردار پر توجہ دی گئی ہے۔ مس لارا ایک صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے عاشق، مرحوم باپ، نئے اینگلو انڈین باپ اور سرکس میں کام کرنے کے دوران اپنی اور اپنے باقی ساتھیوں کی نفسیاتی حالت کا کچھ یوں ذکر کرتی ہے:

پال مراب پاپامرے۔ غریبی چھائی۔ ادبار۔ نحوست۔ مسلسل افلاس سے تنگ آکر ملانے سرکس کے ایک ”فولادی آدمی“ سے شادی کر لی۔ ان مصیبت کے دنوں میں صرف وہی سہارا دینے والا ہمیں میسر آیا تھا۔۔۔ نئے پاپانے جو اینگلو انڈین ہیں، مجھے سرکس کی ٹریننگ دی۔۔۔ مجھے آج تک ڈر لگتا ہے۔ روز شام کو ڈر لگتا ہے۔ ہر شام کو مجھے یقین ہوتا ہے کہ آج پنڈال سے زندہ نہیں نکلوں گی۔ ہم سب کو ڈر لگتا ہے۔ سرکس کے سارے بہادر آرٹسٹوں کو روزانہ موت کا خوف رہتا ہے۔۔۔ جوانی سے لے کر قبر تک کا فاصلہ طے کرنا آسان بات نہیں ہے۔۔۔

اردو میں اینگلو انڈین کرداروں سے متعلق مذکورہ صدر افسانوں پر غور کیا جائے تو اردو افسانہ ان کرداروں سے متعلق جن حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے ان میں پہلی حقیقت یہ ہے کہ اردو افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کا ذکر مرکزی کرداروں کے طور پر کم، مگر ضمنی کرداروں کے طور پر زیادہ ہوا ہے۔ دوسری حقیقت یہ کہ اردو افسانے میں زیادہ تر اینگلو انڈین عورتوں ہی کا ذکر ملتا ہے اور عورتیں بھی وہ عورتیں جو نوکریاں ہیں، نانیکہ ہیں، طوائفیں، فلمی ہیروئنیں، سینما و سرکس میں کام کرنے والی یا سماج میں محض چھوٹے موٹے کام کاج کرنے والی عورتیں ہیں۔ اردو افسانے میں جن اینگلو انڈین مردوں کا ذکر ملتا ہے ان میں کچھ پاگل ہیں اور کچھ اپنے بیوی بچوں کی نظر میں اور کچھ پورے سماج کی نظر میں قابلِ رحم ہیں۔ تیسری حقیقت ذکر کی گئی دونوں حقیقتوں کے نتیجے میں سامنے آنے والی حقیقت ہے کہ ان تمام زن و مرد کرداروں کی سماجی، معاشی اور نفسیاتی حالت در ماندگی کا شکار ہے۔ اس در ماندگی کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ کیا اردو افسانہ اس تاریخی صداقت کی تائید کرتا ہے کہ ہندوستان میں اینگلو انڈین دوسرے درجے کے شہری تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ اینگلو انڈین طبقہ حاشیے پر اس لیے دکھائی دیتا ہے کہ اس طبقے کو نہ انگریزوں نے قبول کیا اور نہ ہی ہندوستانیوں نے؛ گویا اس طبقے کی عدم قبولیت کا سبب اس طبقے کا اینگلو انڈین ہونا ہی ہے۔ دونوں نسلوں: ہندوستانی اور یورپی نسل کے جسمانی اشتراک سے سامنے آنے والے اس نئے طبقے کو دونوں نسلوں ہی کا قبول نہ کرنا، بنیادی طور پر دو مختلف نسلوں کے ایک دوسرے کے مذہب، قوم، کلچر اور رنگ کو قبول نہ کرنے کے ہم معنی ہے۔

اس طبقے کے مجموعی طور پر بے سہارا ہونے کے اسباب یہ ہیں کہ گورے مرد، اجنبی ملک کی عورتوں سے محض جنسی و سماجی (تہذیبی نہیں) ضرورت کے تحت شادیاں کرتے ہیں، (کچھ تو یہ بھی نہیں کرتے)، بچے پیدا کرتے ہیں اور اپنے باپ ہونے کی ذمہ داری سنبھالنے کے بجائے، اپنی اولادوں کو اپنے وجود کا حصہ نہ سمجھ کر انہیں کمپنی، یتیم خانوں، ان کی مقامی ماؤں یا محض تقدیر کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا کمپنی کے افسر جو سلوک ہندوستان کے ساتھ روا رکھتے ہیں بڑی حد تک وہی سلوک ”آدھے ہندوستانی اور آدھے برطانوی طبقے“ کے ساتھ بھی روا رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں اپنے ہوتے ہوئے تھوڑی بہت توجہ اس طبقے پر دیتے ہیں؛ مگر ان کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والا یہ طبقہ سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کا پہلے سے کہیں بڑھ کر سامنا کرتا ہے۔

گورے مردوں کے اپنے بچوں کو نظر انداز کر دینے پر کچھ اینگلو انڈین عورتیں اپنی لاکھ سے جنے ہوئے ان بچوں کو گلے سے لگاتی ہیں۔ وہ عورتیں کسی کتاب میں لکھے ہوئے کسی نظام کو اپنے دل کے ساتھ نہیں لگاتیں؛ بلکہ اپنے جسم کی کھیتی سے پیدا ہونے والی اپنی پیداوار کو اپنے پورے دل کے ساتھ اپنے سینے سے لگاتی ہیں۔ یہاں مرد کے برخلاف عورت کسی حد تک اپنی فطری نگاہ کو کام میں لاتی ہے کہ وہ مرد سے زیادہ فطرت کے عمل کا حصہ بنتی، فطرت و تخلیق کے عمل کو محسوس کرتی اور اپنی فطری تخلیق کو سراہنے، اُسے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ گلے لگانے کا فطری جذبہ اپنے اندر محسوس کرتی ہے۔ یہاں عورت دنیا کی کسی ثقافت کی پیداوار کی نمائندگی نہیں کرتی؛ بلکہ خالصتاً فطرت کی پیداوار کی نمائندگی کرتی ہے؛ مگر افسوس اردو افسانے میں ایسی اینگلو انڈین عورتیں بھی کم سے کم نظر آتی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانے میں زیادہ تر اینگلو انڈین اولادیں بس بھٹکتی ہوئی اور در در کے دھکے کھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اردو افسانے میں اینگلو انڈین عورت اپنی خاندانی حیثیت؛ یعنی ماں، بیٹی اور بیوی کے طور پر کم ہی نظر آتی ہے۔ منٹو کے افسانے ”مجید کا ماضی“ میں مس لینا بطور ماں اپنی دو بیٹیوں کو پالنے کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے ”ڈالن والا“ میں ڈالنا ایک بیٹی ہونے کے باوجود اپنے باپ کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی سکھو بائی بہ یک وقت نوکرانی، بیوی اور ماں کا جیسا تیسرا کردار نبھاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے ”یاد کی اک دھتک جلع“ کی گرہی اپنے شوہر کی وفات کے بعد نوکرانی اور پھر اس گھر کے مالک ناصر کے حق زوجیت میں آنے کے بعد ایک بیوی کا کردار نبھاتی ہے؛ وگرنہ اردو افسانے کی باقی تمام اینگلو انڈین عورتیں سماجی طور پر بے اوقات عورتیں ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز یہ بے اوقات اینگلو انڈین عورتیں ہی زیادہ تر بنتی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہی عورتیں ہی دراصل برطانوی مردوں کی داخلی بد تہذیبی کا زیادہ خمیازہ بھٹکتی ہیں۔ ان عورتوں کا عورت ہونا ان عورتوں کو عام عورتوں کی نسبت زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان کے ماں یا باپ یا دونوں ہی ان کو بچہ راہ میں چھوڑ جاتے ہیں، دوسرا اس وجہ سے کہ ہندوستانی مرد انھیں اجنبی کا خون جانتے تھے؛ جب کہ انگریز بھی انھیں پر ایا خون، پرانی چمڑی جانتے تھے۔ یہاں اینگلو انڈین ماں، اینگلو انڈین چمڑی، دونوں نسلوں؛ یعنی ہندوستانی اور برطانوی نسل کے تعصب، نفرت اور بہیمانہ جنسیت کا نشانہ بنتی ہے۔ جنسی عمل میں وحشت کی کار فرمائی سے ایک حد تک انکار نہیں؛ مگر آدمی کے نگاہ و عمل میں محض وحشت و شہوانیت کی کار فرمائی اس کے اعلا مخلوق ہونے پر سوال قائم کرتی ہے۔ عورت کو محبت کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے محض حریمانہ نگاہوں سے دیکھنا، اس کے داخلی وجود کی تذلیل کے ہم معنی ہے۔ یہ تذلیل ہندوستانی سماج میں خاص طور پر اینگلو انڈین عورتوں کی کی گئی ہے۔ اس تذلیل کے احساس کو اردو افسانہ نگاروں نے خاص طور پر محسوس کیا ہے۔

اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اینگلو انڈین عورتوں کے جسم کی بابت عوامی نگاہوں کو خاص طور پر اپنی نگاہ میں رکھا ہے۔ معاشرہ ان لڑکیوں کو کیسے دیکھتا ہے، منٹو، عصمت اور قرۃ العین حیدر خاص طور پر ان نگاہوں کو دیکھتے اور ان نگاہوں کو

اپنے افسانوں میں بے نقاب کرتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے کے کالے اور سفید مرد اینگلو انڈین عورتوں کو دیکھنے کا آغاز ان کے لباسوں سے کرتے ہیں۔ وہ ان کی فراکوں، اسکرٹوں اور جینز کی پینٹس کو دیکھتے ہیں۔ وہ ان کی قد و قامت، تیکھی ناک، ہونٹوں پہ گہرے رنگ کی لپ اسٹک، ننگی ناگلوں، چھاتیوں اور طرح طرح کے خطوط کو بہ غور دیکھتے ہیں۔ اردو افسانے میں یہ کالے اور سفید مرد اکثر ان لڑکیوں کو سینما میں، سرکس میں، رنڈی خانوں پہ، بازار کے چوکوں پہ، ہسپتالوں کے وارڈوں، فلمی دنیا میں، دفتر میں اور چند ایک کو گھر میں بطور داشتہ یا نوکرانی کے دیکھتے ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں نے جن اینگلو انڈین عورتوں کو طوائف خانوں پہ دکھایا ہے ان کو ٹھوں کا تعلق، فارس روڈ، پونہ اور بالخصوص بمبئی سے ہے۔ واضح رہے کہ لکھنؤ کے برخلاف ان تمام جگہوں کی طوائفیں معاشی طور پر مشکل میں نظر آتی ہیں۔

تاریخی حقائق میں اینگلو انڈین طبقہ دوسرے درجے کی مخلوق کے طور پر نظر آتا ہے (عصمت چغتائی بھی اپنے ایک افسانے: ”ہندوستان چھوڑ دو“ میں اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں)؛ مگر اردو افسانہ ان تاریخی حقائق کی صداقت کے برعکس حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اردو افسانے میں اینگلو انڈین طبقے کی وہی حقیقت بیان ہوئی ہے جو حقیقت بیسویں صدی کے آغاز، وسط اور تقسیم کے بعد سماج میں ان کی حقیقت تھی۔ سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اینگلو انڈین کو کیا کیا سہولتیں اور آسائشیں میسر رہیں، ان سہولتوں کی حقیقت الگ؛ مگر اردو افسانہ نگاری کا آغاز چوں کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا (۱۹۰۳ء) سے ہوا؛ اس لیے بیسویں صدی کے نصف تک اردو افسانہ نگاروں کی نظروں سے جو اینگلو انڈین طبقہ گزرا، وہ طبقہ انھیں حاشیے پہ نظر آتا ہے؛ اسی لیے اردو افسانہ نگاروں کی نظروں میں یہ طبقہ خاص طور پر توجہ کے قابل طبقہ نظر آتا ہے۔

اینگلو انڈین کرداروں سے متعلق اردو میں دوسری قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں یورپی عورتوں یا مردوں کے ہندوستانی مردوں یا عورتوں سے ”محبت“ یا شادی کرنے کا ذکر ملتا ہے؛ مگر ان افسانوں میں ان شادی شدہ جوڑوں کی اولاد کا ذکر نہیں ملتا۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کے افسانے ”مس اڈنا جیکسن“ میں ایک انگریز خاتون ایک ہندوستانی نوجوان سے شادی کرتی ہے۔ مس اڈنا جیکسن ایک کالج کی پرنسپل ہے۔ اُس کے کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی طاہرہ کو اپنے استاد لطیف سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر خود اُس سے بات کرنے میں جھجک محسوس کرتی ہے، اس لیے اپنی پرنسپل کو وسیلہ بناتی ہے کہ وہ اُس کے استاد لطیف سے اُس کی شادی کی بات کرے اور اُسے یہ کہہ کر ہر صورت میں شادی کے لیے قائل کرے کہ اگر اُس نے شادی نہ کی تو وہ خود کشی کر لے گی۔ اڈنا جیکسن لطیف کو خط لکھ کر اپنے پاس بلاتی ہے۔ لطیف کو دیکھتے ہی اڈنا جیکسن کو ہسٹیریا کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اڈنا جیکسن کنواری ہوتی ہے اس لیے وہ اپنی طالبہ کی زندگی کی پروا نہیں کرتی اور لطیف سے خود شادی کر لیتی ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اڈنا جیکسن کی عمر پچاس سال جب کہ لطیف کی عمر پچیس برس ہے۔ اڈنا جیکسن کا یہ غاصبانہ عمل اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ

نوآبادکاروں نے ہندوستان کے محض معاشی وسائل پر ہی قبضہ نہیں جمایا بلکہ انھیں، جہاں، جس طرح سے موقع ملا، انھوں نے ہندوستان پر اپنا حق ملکیت جمایا۔

ہم منٹو اور عصمت کے افسانوں میں فکری و موضوعاتی مماثلتوں کی طرف اس سے پہلے توجہ دلا چکے ہیں۔ مذکورہ بالا افسانے کے تناظر میں عصمت چغتائی کے افسانے ”نئی دلہن“ کو بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ جس طرح منٹو کے افسانے ”مس اڈنا جیکسن“ میں پچاس سالہ مس اڈنا جیکسن ایک پچیس سالہ ہندوستانی نوجوان پر قبضہ جاتی ہے؛ بعینہ عصمت چغتائی کے افسانے ”نئی دلہن“ میں ستر برس کی ولایتی لیڈی ڈاکٹر مس نیوز پچیس چھبیس برس کے ہندوستانی نوجوان نور محمد سے شادی رچا لیتی ہے۔ مس نیوز بد صورت ہے۔ طلاق یافتہ ہے۔ تن تنہا اپنی کوٹھی میں رہتی ہے۔ اپنی دولت کی طاقت کے بل بوتے پر مختلف مردوں کو پھنساتی ہے۔ وہ اُن سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر ہر کوئی اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ بالآخر وہ نوجوان نور محمد کی زندگی پر قابض ہونے میں کامیاب رہتی ہے۔ یہ افسانہ بھی استعمار کاروں کے استحصال کی مختلف صورتوں میں سے ایک نئی صورت کی طرف دھیان دلاتا ہے کہ انگریز مرد ہی نہیں، یہاں عورت بھی ممکن حد تک اپنے طریقے سے ہندوستانی عوام کا استحصال کرتی نظر آتی ہے۔ ایک تو یہ انگریز ڈاکٹر ایک ہندوستانی خاندان سے بچہ جنوائی کی بھاری رقم وصول کرتی ہے۔ اُن سے اپنے نازخزے الگ اٹھواتی ہے۔ پھر ایک نوجوان سے شادی کر کے اُس کی زندگی برباد کر دیتی ہے۔

مجھے وہم تھا مرد ہی اپنی دولت کے زور پر خنسی دلہن بیاہ لاتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ دولت مند عورتیں بھی چاہیں تو چوزے بیاہ لاتی ہے^۳۔

یہاں واضح رہے کہ مس نیوز کے آنے سے قبل مسیتادائی بچے کی جنوائی کے سلسلے میں اپنی خدمات کے لیے حاضر تھی مگر اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اُس کی صلاحیتوں پر اعتبار نہیں کیا جاتا حالانکہ اس سے قبل خاندان کے سارے بچے اسی کے ہاتھ کے تھے۔ مسیتادائی بطور ”ڈاکٹر“ ہندوستانی روایت کی نمائندہ کے طور پر سامنے آتی ہے جسے ”اہل خانہ“ اب شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ مسیتادائی کے پیشے کی نفی کرنا عقل مندانہ فیصلہ تھا یا عامیانہ۔

منٹو کے افسانے ”گھوکا“ میں ایک انگریز نرس جیکب اپنے ایک مریض (ہندوستانی) سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر وہ مریض جیکب کی سونے کی بالیاں چرالے جاتا ہے۔

غلام عباس کے افسانے ”ایک درد مند دل“ کا نوجوان کردار فضل الہی ولایت میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے مگر وہ وہاں کی ایک لڑکی روز مری سے شادی کر لیتا ہے۔ وہ پاکستان لوٹتا ہے تو اُس کا والد اُس کے لیے گھر آنے کے دروازے بند کر دیتا

اور اُس سے مکمل قطع تعلقی کر لیتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”میں بوری ڈوبت ڈری“ میں ایک یورپی ڈاکٹر سڈنی کبر لینڈ (جو غیر ملکی دانش ور ہے اور ہندوستان میں ہندوستانی فلسفہ پر ایک کتاب لکھنے آیا ہے) کو ہندوستان کی ایک نوجوان راہبہ دیدی ماں سے محبت ہو جاتی ہے، وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے، اُسے اپنے ساتھ انگلستان لے جانا چاہتا ہے مگر راہبہ اپنا راستہ ترک نہیں کرتی اور ڈاکٹر سڈنی کو انگلستان ناکام لوٹنا پڑتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ”اگلے جنم موہے بیانا کجیو“ میں ایک ہندوستانی عورت کے ساتھ ایک گورے کے شادی کرنے کے نتیجے میں، اُس فرنگی کو قتل کر دیے جانے کا ذکر ملتا ہے؛ نیز ہندوستانی لڑکی صدف پر ایک امریکی لڑکے کے لٹو ہو جانے اور پھر صدف سے سول میرج کر کے اُسے امریکہ لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر ہی کے افسانے ”دوسرا کنارہ“ کی ایک ہندوستانی عورت جہاں آرابیگم (مطالعہ) بھی ایک انگریز پولیس آفیسر ایلمر ریڈلے سے سول میرج کرتی ہے۔ یہ انگریز بھی شادی کے بعد اپنی ہندوستانی بیوی کو انگلستان لے جاتا ہے۔

اس افسانے میں ہندوستانی عورت کا کردار اس لیے مزید توجہ چاہتا ہے کہ اس افسانے میں اس ہندوستانی عورت کو بھی ایک انگریز مرد سے محبت ہو جاتی ہے؛ مگر وہ خاندانی بندشوں کے باعث اُس سے شادی نہیں کر پاتی۔ اُس کی پہلی شادی ایک ہندوستانی مرد ہی سے ہوتی ہے۔ اس شادی سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوتا ہے مگر وہ اپنے شوہر کے دوسری عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات کی بنا پر اُس سے طلاق لے لیتی ہے اور ایلمر ریڈلے سے سول میرج کر لیتی ہے۔ ایک انگریز سے شادی کے بعد اس ہندوستانی عورت کی زندگی کئی مقامات پر جذباتی کشمکش اور صدمے سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلا موقع وہ، جب وہ اپنے بچے کو چھوڑنا نہیں چاہتی مگر اُسے اُس کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ دوسرا موقع وہ جب اُس کا انگلستانی شوہر یہ گوارا نہیں کرتا کہ اُس کی بیوی اپنی سابقہ اولاد سے کوئی رابطہ قائم رکھے۔ تیسرا موقع وہ، جب وہ اپنے ہندوستانی شوہر کا یہ حکم سنتی ہے کہ بچے کو کبھی یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ اُس کی ماں کا دوسرا شوہر انگریز ہے اور اُس کے سوتیلے بھائی اینگلو انڈین ہوں گے اور آخری موقع وہ جب وہ اپنی دھرتی کو پہلی بار شدت سے محسوس کرتی ہے؛ یعنی جب وہ ہندوستان کو چھوڑ کر مجبوراً انگلستان جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس افسانے میں انڈین اور اینگلو انڈین دونوں طرح کے بچوں سے متعلق، دونوں طرح کے مردوں (ہندوستانی و انگلستانی) کا تعصب اپنی انتہا پر دکھائی دیتا ہے۔

اس کا دل بے انتہا چاہ رہا تھا کہ اپنے بچے کو دیکھے لیکن ایلمر ریڈلے کو قطعاً گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنی گذشتہ زندگی سے کسی قسم کا تعلق بھی قائم رکھے۔۔۔ اس کے پہلے شوہر کا حکم تھا کہ بچے کو یہ تو بالکل معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کی ماں کا دوسرا شوہر ایک انگریز ہے اور اس کے سوتیلے بہن بھائی اینگلو انڈین ہوں گے۔۳۲

اس اقتباس میں اُن اینگلو انڈین بچوں کے لیے، ایک ہندوستانی مرد کے دل میں موجود نفرت و حقارت کے جذبات کو محسوس کیا جاسکتا ہے، جو بچے ابھی تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

منٹو کے افسانے ”کالی شلوار“ میں گورے ایک ہندوستانی عورت سے شادی کے بارے میں تو نہیں سوچتے؛ تاہم اس عورت سے جنسی تعلق ضرور قائم کرتے ہیں۔ اس افسانے میں کئی گورے سلطانہ کے گاہک کے طور پر نظر آتے ہیں۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس چلے جاتے تھے اور تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمنا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی ۳۳۔

یورپی و ہندوستانی مردوں اور عورتوں کی محبتوں اور شادیوں پر غور کیا جائے تو یہ تمام محبتیں اور شادیاں مجموعی طور پر کسی نہ کسی صورت میں مشکل سے دوچار نظر آتی ہیں۔ کبھی میاں بیوی کے درمیان عمر کی حد درجہ تفاوت کا مسئلہ اُن کے بندھن کو اُن کی اپنی نگاہ میں اور معاشرتی نگاہ میں (داخل رہے کہ معاشرتی نگاہ ہر معاملے ہی میں غلط نہیں ہوتی) کش مکش اور شک و شبہ سے دوچار کرتا ہے تو کبھی مشرقی ماں باپ کی ناراضماندی جیسے مسائل مشرقی اور مغربی جوڑے کے تعلقات کے درمیان رکاوٹ بنتے ہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں ہم انگریزی اور اردو لغات کی روشنی میں اینگلو انڈین کے ایک معنی یہ بھی بیان کر آئے ہیں کہ اینگلو انڈین وہ بھی ہوتا ہے جو ایک عرصے سے ہندوستان میں رہ رہا ہو یا رہتا ہو؛ اگرچہ اینگلو انڈین کے یہ معنی اینگلو انڈین کے لیے مخصوص کیے گئے (یورپی و ہندوستانی عورتوں اور مردوں کی شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد) معنی کی کلی ترجمانی نہیں کرتے؛ تاہم ہم لغات کی روشنی میں اینگلو انڈین کے اس معنی کو بھی وقتی طور پر تسلیم یا فرض کر لیں تو اردو افسانے میں اس قسم کے اینگلو انڈین کردار بھی موجود ہیں اور قابل ذکر ہیں جو ہندوستان میں ایک عرصے سے رہ رہے ہوتے ہیں مگر اردو افسانوں میں اُن کی بیویوں یا اُن کی اولادوں کا ذکر نہیں ملتا۔ ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ممکن ہے کہ ان مردوں نے یہاں کی عورتوں سے شادیاں کی ہوں اور اُن کی ان عورتوں سے اولادیں بھی ہوں مگر اردو افسانہ نگاروں نے اپنے موضوعات و تقسیم کے پیش نظر اُن کی ذات سے وابستہ رشتوں کو موضوع بنانے کے بجائے محض اُن کی ذات ہی کو چنا ہوا۔ ان امکانات اور اندازوں کی روشنی میں اردو افسانے میں اس قسم کے اینگلو انڈین ”اینگلو انڈین“ کرداروں پر غور کیا جائے تو ہمیشہ تر ہندوستانی کردار ان کرداروں سے متعلق سخت غصے اور نفرت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں؛ بعینہ یہ ”اینگلو انڈین“ کردار بھی ہندوستانی لوگوں کو غیر مہذب، خود سے کم تر سے سمجھتے اور ان سے حقارت اور نفرت کا تعلق قائم کرتے ہیں۔

اس قسم کے ”اینگلو انڈین“ کرداروں کے مظالم کے خلاف نفرت کا اظہار ابتدائی اردو افسانے ہی میں ہونا شروع ہو جاتا

ہے۔ مثلاً پریم چند کے افسانے ”قاتل“ کے کبیری کردار ایک ہندوستانی ماں اور اُس کا بیٹا دھرم ویر ہیں۔ دھرم ویر سبھا تحریک کا ممبر اور انقلابی خیالات رکھنے والا نوجوان ہے۔ دونوں ماں بیٹا انگریزوں سے آزادی چاہتے ہیں مگر ماں محض جلسوں اور تقریروں کے ذریعے آزادی چاہتی ہے؛ جب کہ بیٹا آزادی کے لیے خونی انقلاب کو ضروری سمجھتا ہے۔ ماں بیٹے کے درمیان یہی کشمکش افسانے کا موضوع ہے۔ تقسیم سے پہلے ہندوستان پر قابض انگریزوں کے خلاف دھرم ویر کے انقلابی خیالات دیکھیے:

وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑے گا جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ ناگ لینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہو گا اور کوئی طریقہ نہیں۔ ہمیں ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے، اتنا ایک ہزار جلوسوں سے نہیں۔^{۳۳}

دھرم ویر انگریزوں سے آزادی کی خاطر اپنے خیالات پر عمل کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ ایک انگریز افسر کو قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس انگریز کو بچانے کی خاطر دھرم ویر کی ماں اُس کی گولی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ افسانے میں ماں کا کردار انگریزوں سے صلح و مصلحت کے تحت آزادی کا علمبردار ہے، جب کہ دھرم ویر کا کردار کسی بھی شکل میں بس تبدیلی کا نمائندہ۔ تقسیم سے پہلے خیالات کی یہ دونوں طرح کی لہریں ہندوستان میں چل رہی تھیں۔ پریم چند کے افسانوی کرداروں: ماں اور بیٹے کی داخلی حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو ان کرداروں کے عملوں کی تہ میں انگریزوں کے خلاف دھمکی کا عنصر بھی موجود ہے؛ نیز ایک بیٹے کے ہاتھوں سے ماں کو قتل کرانے اور دشمن کو بچانے کے عمل کے پیچھے مصلحت کا پہلو بھی۔

پریم چند کے افسانے ”ادیب کی عزت“ میں ایک انگریز، ایک مشرقی ادیب قمر کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا اور اُسے مغربی شعرا، بارتن، شیلے ٹینی سن کی کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا ترجمہ اپنی زبان میں کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو اس مشورے کے ردِ عمل میں قمر اس انگریز کے مشورے کے خلاف اپنے غصے کا اظہار یہ کہہ کر کرتے ہیں:

ہمارے یہاں روحانیت کا اتنا بھی فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔^{۳۵}

احمد علی کے افسانے ”ہماری گلی“ کے مرکزی کردار مرزا کا اکلوتا بیٹا گاندھی کی تحریک ترک موالات (ایک سیاسی تحریک جو ہندوستان میں گانگریوں نے حکومت سے تعاون ترک کرنے کے لیے چلائی تھی) کے جلوس میں شریک ہوتا ہے۔ گھنٹے گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں۔ پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند انگریز، ہندوستانی لوگوں کے ہجوم اور قومی غصے کو دیکھ کر پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ جوں ہی

جلوس ایک آئینی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو ڈپٹی کمشنر گولی چلانے کا حکم دے دیتا ہے۔ انھی گولیوں کی بوچھاڑ میں مرزا کا اکلوتا بیٹا بھی مارا جاتا ہے۔ بیٹے کی لاش دیکھ کر مرزا کی بیوی گاندھی کو کوستی اور انگریزوں کو بددعا میں دیتی ہے:

ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے۔ میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔^{۳۶}

انگریز کی ہندوستانی طبقے کے خلاف اور عام ہندوستانی طبقے کی انگریز کے خلاف نفرت منٹو کے افسانے ”نیا قانون“ میں عروج پر نظر آتی ہے۔ اس افسانے کے اہم کردار: ہندوستانی طبقے کا حاشیائی کردار: منگو کوچوان اور ایک گورا افسر ہیں۔ افسانے کا راوی منگو کوچوان اور گورے کے درمیان تصادم کے ذریعے عوام کے نوآبادکاروں سے متعلق دے ہوئے جذبات کو سامنے لاتا ہے۔ افسانے کا تھیم، منگو کوچوان کی ہندوستان میں یکم اپریل کو نئے قانون کے نفاذ سے متعلق خوش فہمی اور اس خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔

منگونے قانون کا نفاذ اسی لیے چاہتا ہے کہ وہ موجودہ حکمرانوں اور قوانین سے نامطمئن ہے۔ وہ چھاؤنی کے گوروں سے اس لیے تنگ ہے کہ وہ منگو کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؛ گویا وہ ذلیل کتا ہو۔ ان نفرت انگیز جذبات کے ردِ عمل میں منگو بھی گوروں کی عدم موجودگی میں انھیں ملعون، منحوس، سفید چوہے اور بندروں کی اولاد کہتا ہے۔

منگو کوچوان جب اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یکم اپریل کو نیا قانون نافذ ہو جائے گا تو یہ غلط فہمی کا وقفہ منگو کوچوان کو گوروں کے ہندوستانیوں کے ساتھ طرز سلوک پر نظر ثانی کرنے اور اس نظر ثانی کے نتیجے میں سامنے آنے والے اپنے جذبات کا مزید کھل کر اظہار کرنے کا موقع دیتا ہے۔

یکم اپریل کو چھاؤنی ہی پر منگو کوچوان اپنے تانگے پر بیٹھا سواری کا منتظر تھا کہ اُس کا سامنا ایک ایسے گورے سے ہو جاتا ہے جس سے پہلے بھی اُس کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ گورا حسب معمول اُس سے پرر عونت لہجے میں مخاطب ہوتا ہے۔ منگو بھی اُس کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ہیرامنڈی جانے کا کرایہ اس روز منگو اُس سے معمول سے کچھ زیادہ ہی مانگ لیتا ہے۔ گورا ہیرامنڈی کی چھڑی دو تین بار آہستہ آہستہ منگو کوچوان کی ران پر مارتا ہے اور اُسے نیچے اترنے کا اشارہ کرتا ہے؛ ردِ عمل میں منگو کوچوان اُسے دھڑا دھڑ پینٹا شروع کر دیتا ہے۔ پولیس کے سپاہی جب اُسے تھانے لے جا رہے تھے تو راستے میں اور تھانے میں پہنچ کر وہ نیا قانون نیا قانون کی رٹ لگاتا ہے مگر سپاہی اُس کی بات پر دھیان نہیں دیتے اور اُسے حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔

اس افسانے میں منٹو اپنے کردار منگو کوچوان کے ذریعے نوآبادکاروں کے خلاف کھلم کھلا مزاحمتی رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ منٹو منگو کوچوان کی زبانی واضح طور پر کہتے ہیں:

استاد منگلو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔۔۔ آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے، رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔^{۳۷}

منٹو کے افسانے ”نیا قانون“ میں ایک گور ایک کوچوان پر بے وجہ تشدد کرتا ہے۔ منگلو کوچوان تو ایک خوش فہمی کے باعث میں اُس سے بدلہ لے لیتا ہے؛ مگر کرشن چندر کے افسانے ”دو فرلانگ لمبی سڑک“ کا ایک بوڑھا کوچوان ایک گورے کے بے وجہ تشدد کے سامنے بالکل بے بس محسوس ہوتا ہے:

تائگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے پھر تائگے والے کا چڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرام زادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تائگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے، لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔^{۳۸}

مذکورہ اقتباس میں ایک گورے کا ظلم، ایک ہندوستانی بوڑھے کی بے بسی اور عوام کے دل و دماغ میں موجود گوروں کی دہشت قابل توجہ ہے۔

عصمت چغتائی کے افسانے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی بیان کنندہ بھی منٹو کے کردار منگلو کوچوان کی طرح انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا طرح طرح سے اظہار کرتی ہے:

مجھے سکھو بائی پر غصہ آتا تھا۔ سور کی بچی سفید قوم کے ذلیل کئے کا ترنوالا بنی ہوئی تھی۔۔۔ اس کا رنگ جو پہلے بندر کی طرح لال چندر تھا جھلس کر کتھی ہو گیا تھا۔^{۳۹}

عصمت بطور راوی یہ سب کچھ ہندوستان میں رہنے والے ایک اینگلو انڈین کردار ولیم ایرک جیکسن کے بارے کہتی ہے۔ عصمت چغتائی ہی کے افسانے ”لال چیونٹے“ میں انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں کو لال چیونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پریم چند کے افسانے ”شہر نچ کا کھلاڑی“ کے ایک کردار میر روشن کی زبانی انگریزوں کے چہروں کو لال بندر سے تشبیہ دی

گئی ہے

غلام عباس کے افسانے ”سرخ جلوس“ میں ایک بمبئی کا سیٹھ، جو کہ ایک ہوٹل ”ستارہ مشرق“ کا مالک ہے۔ وہ ہوٹل جس میں زیادہ تر مغربی ممالک کے سیاح آ کر مقیم ہوتے ہیں۔ سیٹھ کے اس ہوٹل کا میئنجر ایک انگریز ہے مگر سیٹھ اس انگریز میئنجر پر اعتبار نہیں کرتا اور اس میئنجر کی نگرانی کے لیے باقاعدہ ایک ہندوستانی اسسٹنٹ میئنجر کا بندوبست کرتا ہے۔

اردو افسانے کے انڈین کردار اینگلو کرداروں سے اپنے غصے، نفرت، عدم اطمینان اور عدم بھروسے ہی کا اظہار نہیں کرتے، کچھ کردار ان کی ہندوستان میں موجودگی کو حسرت سے بھی یاد کرتے ہیں۔ مثلاً اوپندر ناتھ اشک کے افسانے ”کالے صاحب“ میں ایک رکشے والا، جو کہ تقسیم سے پہلے کمشنر ڈک کے ہاں بیر اتھا، ایک دیسی افسر شری واستو (جس کی سماجی حیثیت ڈپٹی کلکٹر کی ہے) سے گفتگو کے دوران میں نہ صرف اپنے انگریز افسر ڈک کو حسرت سے یاد کرتا ہے بلکہ اس حسرت کا بھی اظہار کرتا ہے کہ کاش گورے صاحب اُسے بھی اپنے ساتھ ولایت لے جاتے۔ رکشے والا دیسی افسروں سے کیوں ناخوش نظر آتا اور گورے افسروں کو کیوں حسرت سے یاد کرتا ہے؟ ان سوالات کے جوابات رکشے والے کی زبانی پڑھیے:

انگریز یہاں سے گئے کالے صاحب آئے کہ ہماری قسمت پھوٹی۔ دیسی صاحبوں کو نہ ہمارے کام کی سمجھ نہ پرکھ، نہ ہم ان کے کام کے نہ وہ ہمارے، ہم نے تو درخواست دی تھی کہ ہمیں کوئی دوسرا کام نہیں آتا ہمیں گورے صاحبوں کے ساتھ ولایت بھیج دیجیے پر ہماری کسی نے نہ سنی۔۔۔ انگریزوں کے راج میں جو مومج تھی وہ اب کہاں۔۔۔ دن رات تہوار پر انعام ملتے تھے، ہمارے ہی نہیں بیوی بچوں تک کے کپڑے بن جاتے تھے، اب بتائیے اتنا ہم کہاں سے پائیں کیسے بیوی بچوں کا پورا کریں، لاچار ہو کر رکشا چلاتے ہیں خون سکھاتے ہیں کسی دن اسی طرح لڑھک جائیں گے۔^{۴۰}

ہم صاحب کے کپڑے دیکھتے تھے۔۔۔ انگریز لوگوں کی بڑی باتیں تھیں، ایک وقت ایک سوٹ پہنتے تھے، رات کا الگ، دفتر کا الگ، دن کے آرام کا الگ، سیر سپاٹے کا الگ، پھر ڈز سوٹ، گولف سوٹ، پلو سوٹ، شکار سوٹ۔۔۔ ان سب کو ٹھیک جگہ پر رکھنا دھوبی کو لینا دینا، صاحب کو پہنانا۔ یہی کام تھا ہمارا، دیسی صاحب کیا سمجھیں، کیا پرکھیں ہمارا کام، دن رات مہینوں برسوں ایک ہی سوٹ گھسائے جاتے ہیں۔^{۴۱}

شری واستو رکشا والے کی باتیں سن کر اندر ہی اندر پشیمان سا ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کے باوجود بھی ایک رکشا والے کو ایک گھٹے کا ایک روپیہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس رکشا والے کو اُس نے دس آنے میں ایک گھٹے کے لیے خریدا تھا۔ شرمندگی کے احساس پر کھوکھلی فتح پانے کے لیے شری واستو رکشا والے کو انگریزوں کے رہن سہن اور ہندوستانیوں کے رہن سہن کا فرق سمجھاتا ہے۔

ان کے اور اپنے کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، رہنے، سہنے میں بڑا فرق ہے، وہ لوگ گوشت، مچھلی کھانا، شراب پینا برائیں سمجھتے، گائے اور سور کا گوشت کھاتے ہیں، ہمارے ہاں ان کو چھونا بھی پاپ ہے، ان کی عورتیں ناچتی ہیں ہمارے ہاں۔۔۔^{۴۲}

افسانے کے آخری جملے میں اینگلو عورتوں کے رقص سے متعلق شری واستوکا تعصب توجہ طلب ہے۔ اینگلو انڈین طبقے کے تناظر میں یہاں یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ اس طبقے کے محبوب مشاغل میں ایک مشغلہ رقص و موسیقی بھی تھا؛ گویا اینگلو انڈین طبقے کا وجود نسلی تناظر ہی میں نہیں، اُن کے اوڑھنے پہننے، رہن سہن، کھانے پینے اور مشاغل کے تناظر میں بھی ہندوستانیوں کے لیے بہ یک وقت تحارت اور کشش کا سبب بنتا ہے۔

مجموعی طور پر اردو کے ہندوستانی افسانوی کردار انگریزوں کے کلچر میں کشش محسوس کرتے اور پھر ساتھ ہی ساتھ اُن کی حکومت اور کلچر کے خلاف ناپسندیدگی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً وہ انگریزوں کے طرز رہن سہن، ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کے رویے، اُن کے لباس، زبان اور مشاغل کے خلاف مزاحمت کا رویہ رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اُن کی زبان، لباس اور کلچر کی کئی چیزوں سے اندر ہی اندر متاثر بھی نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف ہندوستانی افسانوی کردار ہوں یا انگلستانی افسانوی کردار، دونوں اینگلو انڈین عورتوں میں خاص طور پر جنسی کشش محسوس کرتے ہیں۔ دونوں نسلوں، دونوں خطوں کے کردار ان عورتوں کو ایک شے سمجھتے ہیں، انہیں استعمال کرتے ہیں اور پھر انہیں ان کے اوپر چھینک کر اپنے جسم ہی کو نہیں، انا کو بھی سکون پہنچاتے ہیں۔ اردو ادب کی مجموعی نگاہ ”انسانی“ سماج کی طرف سے اس اقلیتی اینگلو انڈین طبقے کی روح پر لگے ”زخم“ کو دیکھتی اور شرمندگی اور دکھ کے ملے جلے احساس کو محسوس کرتے ہوئے، اس سماج کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتی ہے۔

اپنی شناخت کے تناظر میں اینگلو انڈین طبقہ تقسیم سے پہلے ہی ہندوستان میں ایک اقلیتی طبقہ تھا؛ ایک ایسا اقلیتی طبقہ جس کے وجود کو نہ اُن کے والدین نے قبول کیا اور نہ ہی سماج نے۔ تقسیم کے بعد اس طبقے کے وجود کو مزید تقسیم ہونے کے کرب ناک تجربے کا سامنا کرنا پڑا کہ تقسیم کے بعد اُن کے لیے وہ جگہ بھی باقی نہیں بچی تھی جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ تقسیم سے پہلے بھی وہ اس جگہ (ہندوستان) پر اپنے وجود کو اجنبی جانتے تھے؛ اور اب تو اُن کا اجنبیت کا احساس مزید گہرا ہو گیا جب ایک فطری وغیر جانبدار زمین کو بھی ایک طرح سے اُن کے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لیا گیا۔ آدمی اس دنیا میں جگہ کے ساتھ بستا ہے یا اپنے رشتوں اور ان رشتوں سے جڑی ہوئی یادوں کے ساتھ۔ ایک سوچنے، جذبات رکھنے والے طبقے سے، اسی انسانی دنیا میں ہوتے ہوئے، ان تینوں چیزوں کے، اُن کے پاس ہونے کا احساس چھین لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وہ طبقہ انسانوں سے اتنی بھری پری دنیا میں اپنے وجود کو کن نگاہوں سے دیکھے گا؟

آدمی محض اپنی ہی نگاہوں سے اپنے وجود کو نہیں دیکھتا؛ آدمی دوسروں کی نگاہوں میں بھی اپنی حیثیت، اپنی شناخت اور

پہچان کے جذبات کو محسوس کرتا ہے۔ دوسرے، آدمی کی محض اسی حیثیت اور شناخت کو تسلیم نہیں کرتے، جو شناخت اُس کی فطری، اصل شناخت ہوتی ہے، دوسرے بعض اوقات آدمی کی شناخت کو مسخ کرتے اور کبھی اُس کی نظر میں اُس کی شناخت کو محدود ثابت کر کے، اپنی شناخت کی برتری کے احساس کو دوسرے پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ یہی کچھ کیا کہ ان کی زبان، ادب، لباس، طور اطوار اور مذاہب کو اُن کی نظروں میں مشکوک ٹھہرانے کی کوشش کی اور دوسری جانب اپنی ہر شے کو اُن کی نظروں میں مستند ٹھہرا کر انہیں عجیب نفسیاتی دبدھے کا شکار کیا۔ اس صورت میں:

وہ پورے یورپی بن سکے نہ پورے ہندوستانی ہی رہ سکے۔ وہ دو غلطے تھے۔۔۔ وہ اس التباس کا شکار تھے کہ وہ دوہری ثقافتی شہریت رکھتے تھے۔ یہ التباس انہیں ایک انوکھے تقاضے کے اظہار پر بھی مائل رکھتا تھا۔ وہ ایک محکوم معاشرے میں حاکم ثقافت کے ذوق اور فہم و فراست کے علم بردار ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ثقافتی شناخت کے عدم تعین کے شدید بحران کا شکار تھے۔ وہ حاکم ثقافت کے نہ تو نمائندے تھے نہ ترجمان، بلکہ اس ثقافت کی طاقت کے مظاہرے کا محض ذریعہ اور آلہ کار تھے۔۔۔ ان کے پاس دوہری ثقافتی شہریت نہیں، دو غلطی ثقافتی شخصیت تھی جو شناخت کے بحران کو حل کرنے کی تخلیقی قوت سے محروم تھی ۳۔

ثقافتی شناخت کے ضمن میں ناصر عباس نیر نے اس اقتباس کے ذریعے اگرچہ ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیاتی صورتِ حال کو بیان کیا ہے مگر اس اقتباس پر اینگلو انڈین طبقے کے تناظر میں غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ محض ہندوستانی نوجوانوں ہی کو نہیں؛ اینگلو انڈین کو بھی شناخت کے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھی کسی ایک طرف کے نہیں رہے تھے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے لوگ تو پاکستانی و ہندوستانی کہلائے جانے لگے تھے مگر اب اینگلو انڈین خود کو کیا کہتے؟ وہ تقسیم سے پہلے بھی اقلیت تھے؛ وہ اب بھی اقلیت تھے؛ بے شک وہ اقلیت تھے مگر وہ پیدا تو ہندوستان ہی میں ہوئے تھے۔ اُن کا ہندوستانی مٹی سے ایک جذباتی، محسوساتی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ تقسیم کے دوران ہندو مسلمان اپنا اپنا الگ وطن حاصل کرنے کے باوجود شناختی بحران کے مسئلے سے دوچار ہوئے تو اس صورتِ حال میں اینگلو انڈین طبقے پر کیا بیتی ہوگی؟

بٹوارے کے وقت ہندو، سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کو کن نگاہوں سے دیکھ رہے تھے؟ تقسیم کے نفسیاتی اثرات ان دونوں قوموں پر کس کس نوعیت کے ہوئے؟ اردو میں سعادت حسن منٹو کے چند افسانے ان اثرات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً اس تناظر میں منٹو کے افسانے ”سہانے“ کے چار کردار قابل ذکر ہیں۔ چاروں آپس میں دوست ہیں۔ تین ہندو ہیں، ایک مسلمان۔ مغربی پنجاب میں ایک ہندو کردار کا چچا مارا جاتا ہے تو وہ (جگل) اس صدمے کے زیر اثر اپنے مسلم دوست ممتاز سے کہتا ہے:

جگل کولاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیر

اثر باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا ”میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا؟۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔“ یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں یہ بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔“

آدمی پر مسلط کی گئی شناختیں یا اُس کی خود اختیار کی گئی شناختیں، سماجی سطح پر اُس کے تحفظ ہی کا نہیں؛ کبھی بے وجہ اُس کے لیے خطرے کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ اوپر بیان کیے گئے اقتباس میں جنگل اور ممتاز کی نفسیاتی حقیقت ہندو مسلم شناخت کے مسئلے کی واضح طور پر نمائندگی کر رہی ہے۔ ممتاز کا ہندوستانی اور مسلم شناخت کا حامل ہونا کیسے بے وجہ اُس کے لیے خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔ جنگل وقتی طور پر ممتاز کی بنیادی، انسانی شناخت کو بھول جاتا ہے اور مذہبی و ثقافتی شناخت کا احساس اُس پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ ممتاز کے ساتھ اپنی دوستی کا اصل رشتہ بھول جاتا ہے۔

منٹوکا ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ استعارہ ہے اُس جگہ وہ دنیا کا جہاں آدمی نے کبھی کچھ دیر رہنے کا تجربہ کر لیا ہوتا ہے، جس تجربے کو آدمی دہرانا، مکمل طور پر چھینا چاہتا ہے مگر آدمی کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو کبھی وطن و قوم کے فلسفے کی بنا پ، کبھی مذہب و ملت کے فلسفے کی بنا پر اور کبھی رنگ و نسل کے تفاوت کی بنا پر چند باتوں کے ذریعے سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً آدمی ایک ہی بار ملے ہوئے اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو اپنی نگاہ سے دیکھنے، جینے سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس محرومی کی بھلا کوئی بھی تلافی ہو سکتی ہے؟ اینگلو انڈین جو بھی تھے، اُن کا پہلا ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ ہندوستان تھا۔ وہ وہاں پیدا ہوئے تھے، وہ وہیں رہنا چاہتے تھے؛ مگر تقسیم ہند کے ساتھ اُن کے وجود کو بھی تقسیم ہونا پڑا۔ انھیں اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے نکل کے ایک اجنبی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جانا پڑا۔ آخر کس بنا پر؟ اس بنا پر کہ وہ مذہباً عیسائی تھے، وہ آدھے کالے، آدھے گورے تھے۔ ان کی زبان اجنبی تھی۔ اُن کے لہجے، اُن کا رہن سہن کچھ الگ تھا۔ پہلے انھیں اُن کے اولین، بنیادی رشتوں نے اپنے وجود سے جدا کیا اور پھر ایک مسلط کردہ تقسیم کے بعد کئی اینگلو انڈین کو اس جگہ سے بھی جدا ہونے کا صدمہ سہنا پڑا جو جگہ اُن کے لیے ماں کی آغوش کا متبادل تھی۔ آدمی کا ایک گھر آدمی کے اندر ہوتا ہے اور ایک گھر باہر۔ آدمی کے اندر کے گھر میں اس کی یادیں بسیرا کرتی ہیں اور باہر کے گھر میں اس کی یادوں سمیت آدمی خود۔ اینگلو انڈین کو ان دونوں گھروں سے معذولی کا زخم سہنا پڑا۔ پہلے پہل اُن کے رشتوں نے انھیں اپنا ماننے سے انکار کر دیا اور پھر جس جگہ پر وہ رہے تھے اُس جگہ کے ”مالکین“ نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اس طرح اینگلو انڈین کو اپنی شناخت کے سلسلے میں دہرے بھران کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے کہ اینگلو انڈین اب جس جگہ (ہندوستان، پاکستان) پر رہ رہے تھے اُس جگہ پر اُن کی شناخت اس جگہ کے باسیوں کے لیے ایک داخلی کشمکش اور آویزش کا باعث تھی۔ چون کہ انگریز ہندوستان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کر کے نہیں گئے تھے، اس لیے اُن کی زیادتیوں کی قیمت بھی کسی نہ کسی حد

تک اینگلو انڈین کوچکانا پڑی۔ مذہبی ہوں یا سانی، ثقافتی ہوں یا خاندانی، اینگلو انڈین کی ساری شناختیں مجموعی طور پر اب ان کے حق میں نہیں رہی تھیں۔ وہ اپنے ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ میں ہوتے ہوئے بھی اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے جلا وطن ہو گئے۔ جو اپنے ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ میں آج بھی رہ رہے ہیں وہ جگہ تو انھیں سوتیلی نگاہوں سے نہیں دیکھتی؛ ہاں مگر اُس ”جگہ“ کے ”مالکوں“ کی نگاہیں گاہے گاہے اُن سے یہ پوچھتی رہتی ہیں کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ اب تک بھی ”یہاں“ ہیں تو کیوں ہیں؟ کس لیے ہیں؟

یہ تمام سوالات اینگلو انڈین طبقے سے ہندوستانی اور خالص انگریز طبقہ ہی نہیں پوچھتا، ”بعض“ اینگلو انڈین خود بھی خود سے پوچھتے ہیں۔ مثلاً اگر شن چندر کا افسانہ ”جیکسن“ اس تناظر میں وہ اہم افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار جیکسن اگرچہ اینگلو انڈین ہے؛ مگر وہ اپنی اس شناخت سے نفرت کرتا اور خود کو صرف انگریز سمجھتا ہے۔ جیکسن خود ہی نہیں، اس کے زیر تربیت پلٹنے والی اس کی دونوں بیٹیاں سنتھیا اور روزی بھی اپنی اینگلو انڈین شناخت سے حد درجہ نفرت کرتی ہیں:

سنتھیا تو اتنی راسخ الاعتقاد تھی کہ آج تک کسی ہندوستانی مرد کے ساتھ وہ ناچتی بھی نہ تھی اور اس قدر محتاط تھی وہ کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دور پار کے دوستوں کے دوستوں میں بھی کوئی ایک ہندوستانی ہو گا۔ اسے اپنے اینگلو انڈین ہونے کا شدید احساس تھا اور اپنے کھلتے ہوئے صبح حسن کے باوجود جب اسے یورپین لوگ اینگلو انڈین سمجھتے، تو وہ اپنے مقدس اینگلو سکسن خون میں ہندوستانی ملاوٹ کو صلواتیں سانے لگتی، یہ کمبخت ہندوستانی ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں... حتیٰ کہ سنتھیا کے خون میں بھی انھوں نے یہ گندی ملاوٹ کر دی تھی ۴۵۔

جیکسن لاہور کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس آفیسر ہے۔ بیس سال ہندوستان میں بادشاہت کر چکا ہے۔ چار دن بعد ہندوستان تقسیم ہونے والا ہے۔ چار دن بعد جیکسن کی بادشاہت ختم ہونے والی ہے؛ مگر جیکسن کو اس بادشاہت کے ختم ہونے کی کچھ خاص پروا نہیں ہے کہ وہ اس بادشاہت کے دوران ڈھیر سارا پیسہ اکٹھا کر چکا ہے۔ وہ اپنی آنے والی زندگی کو بہت مزے سے گزارنے کے لیے تمام منصوبے بنا چکا ہے۔ وہ یارک شائر میں ایک گھر اور ڈیری فارم خرید چکا ہے۔ دونوں بیٹیوں کو انگلستان لے جانے اور بیوی کو طلاق دے کے ہندوستان چھوڑ جانے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کی انگلستان کے شریف گھرانوں کے لڑکوں سے شادی کرے گا اور خود بھی کسی انگریز عورت سے شادی کر کے نئے سرے سے ایک اور عیاشانہ زندگی شروع کرے گا؛ مگر اس کے سارے منصوبوں کو اس کی چھوٹی بیٹی روزی اسے ایک خط لکھ کر تباہ کر دیتی ہے کہ روزی کو ایک ہندوستانی لڑکے آرنڈ سے محبت ہو جاتی ہے۔ روزی اپنے باپ کو خط لکھتی ہے، جس میں وہ ہندوستانی لڑکے کے ساتھ؛ نیز ہندوستان کے پورے کلچر اور تہذیب کے ساتھ اپنے دو سالہ محبت کے تجربے کا اظہار کرتی ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستان کے کھانوں، لباس، موسیقی، رقص، کتابوں اور انسانوں سے محبت کا اظہار کرتی ہے بلکہ اپنے باپ کے خیالات اور اعمال کی کمیوں کو بھی بے باکی سے سامنے لاتی ہے۔ روزی اپنی ہندوستانی اور خاص طور پر انسانی شناخت

کو پورے دل سے گلے لگا کر اس پر فخر کرتی ہے اور اپنے باپ کو بھی اس شناخت کو قبول کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔

پچاس سال تک مجھ سے دھوکا کیا۔ تم نے زندگی بھر اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔ تم نے اپنے خون سے اپنے ہندی پن کو الگ کرنا چاہا۔ تم نے اپنی قوم پر حکومت کی۔ جب کہ تمہیں اس کی خدمت کرنی چاہیے تھی، تم نے ہندو اور مسلمانوں کو لڑوایا... آج میری آنکھیں کھلی ہیں اور میں نے اس زندگی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں آئندہ کے ساتھ جا رہی ہوں۔ آئندہ کے پاس اب کچھ نہیں ہے... اس کی روح اپنی ہے۔ اس کی تہذیب اس کے پاس ہے... ہم دونوں نے ایک نئی انسانیت کا پیغام سنا ہے... ہم لوگ ہندوؤں کے پاس جائیں گے، مسلمانوں کے پاس جائیں گے۔ اور شاید کوئی ہماری بات نہیں سنے گا اور شاید اسی طرح ہماری موت بھی ہو جائے گی اور شاید یہ بڑی حماقت ہوگی، اینگلو انڈین سماج سے غداری ہوگی۔ مگر کوئی مجھ سے نہ جانے کون کون بار بار یہی کہتا ہے تو کر، تو یہ کر۔ تو اسی طرح اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گی۔

اپنی لاڈلی بیٹی کا خط پڑھ کر جیکسن قد آدم شیشے کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ آئینہ اسے بتاتا ہے کہ اس کے خدو خال ہندوستانی ہیں؛ مگر وہ اپنے خدو خال کی حقیقت سے لڑتا ہے۔ وہ خود سے کہتا ہے کہ وہ ہندوستانی نہیں، انگریز ہے۔ جیکسن اپنی شناخت کی حقیقت سے اس حد تک الجھتا ہے کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہوتی کہ وہ حقیقت میں کیا تھا، کہاں کا، کدھر کا تھا؟ وہ اب کہاں رہے؟ ہندوستان میں یا اس جگہ پہ جہاں اس نے اپنا گھر خرید لیا تھا؟ جہاں اس کی نئی بیوی اس کا انتظار کر رہی تھی؟ جہاں وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو لے جانا چاہتا تھا؟

یہ تمام سوالات جیکسن کو شدید کنکاش میں مبتلا کر دیتے ہیں؛ مگر سب سے زیادہ اذیت کا باعث اس کے لیے یہ سوال بنتا ہے کہ اس کی شناخت ہندوستانی ہے یا انگلستانی؟ وہ اپنے اندر جنم لینے والے اس مسئلے کو حل نہیں کر پاتا۔ وہ اپنے انگریز ہونے کی شناخت کو تودل سے لگاتا ہے؛ مگر اپنے خون میں ہندوستانی خون کی ملاوٹ کے معاملے کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اپنی شناخت کے سلسلے میں کنکاش کا مسئلہ اس کے اندر اس انتہا تک پہنچا جاتا ہے کہ وہ نشے کی حالت میں خود کو گولی مار دیتا ہے۔ کہانی میں، اسے نشے کی حالت میں اس لیے دکھایا گیا ہے کہ وہ ہوش کی حالت میں، اپنی شناخت کے بحران کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ اسی حالت میں وہ جب وہ گولی چلاتا ہے تو محض خود کو نہیں مارتا، اینگلو انڈین طبقے کی شناخت کے بحران کے ناقابل برداشت ہونے، اور اس طبقے کے لیے راہوں کے مسدود ہونے کا گویا اعلان بھی کرتا ہے۔ ویسے افسانہ نگار چاہتے تو جیکسن کو خود کشی سے بچا بھی سکتے تھے، اور اسے اپنی شناخت کے بحران کو تسلیم کرنے کی ہمت سے سرفراز کر سکتے تھے، مگر شاید اس طرح وہ شناخت کی سیاست کے تاریک پہلو کو اجاگر نہ کر پاتے!

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۱۹۹۰ء) لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ۔
mnasrullah6363@gmail.com

- ۱۔ شان الحق حقی، اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری (کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۷ء)، ۳۶۔
- ۲۔ گوریاجے مور [Gloria J. Moore]، "A Brief History of the Anglo-Indian"، مشمولہ، *International Journal of Anglo-Indian Studies*، جلد ۱، شمارہ ۱، جرنل ایڈیشن (نیوز لیٹ، ۱۹۹۶ء)، ۵۰۔
اصل متن:

The term "Anglo-Indian" was first used by Warren Hastings in the eighteenth century to describe both the British in India and their Indian-born children. In the nineteenth century the British in India still separated themselves from coloured people but accepted fairer (and often wealthier) people of dual heritage as "Anglo-India". Darker (and usually poorer) people were given the name "Eurassian".

دیکھیے: <https://www.international-journal-of-anglo-indian-studies.org/index.php/IJAIS/article/view/78/71>

- ۳۔ محمد عمران علی، "The Anglo-Indian Women's Status in the Early Colonial Bengal"، مشمولہ، *An International Peer Reviewed & Refereed Multidisciplinary & Multiple Languages Research Journal* (۲۰۲۱ء)، ۱۵۷۔
اصل متن:

They developed as Eurasian, Luso-Indian, and finally, the Anglo-Indian.

دیکھیے: https://www.researchgate.net/publication/363457097_The_Anglo-Indian_Women's_status_in_the_early_colonial_Bengal

- ۴۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت (لاہور: طیب پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ۲۹-۳۰۔
- ۵۔ شان الحق حقی، اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری (کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۷ء)، ۵۳۵۔
۱۔ یوریشیائی، مخلوط یورپی و ایشیائی (خصوصاً ہندوستانی والدین کی اولاد)۔ ۲۔ یورپ و ایشیائے تعلق رکھنے والا۔ اسم: یوریشیائی نژاد آدمی۔
- ۶۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) (کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۷ء)، ۱۱۶۹۔
انگلستان کا، انگلستانی، انگریزی، انگریز قوم سے منسوب شخص یا چیز وغیرہ، عموماً دوسری قوم سے مخلوط ہونے کی نسبت رکھنے والی چیز یا شخص کے ساتھ مستعمل، جیسے: اینگلو انڈین، اینگلو عربک وغیرہ۔ انگریز اور دیسی نسل کا مخلوط ہندوستانی۔
- ۷۔ علمی اردو لغت، مؤلف: وارث سرہندی (لاہور: علمی کتب خانہ، ۱۹۸۷ء)، ۱۶۳۔
وہ انگریز جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور وہیں رہنے سنے لگا ہو۔
- ۸۔ علمی اردو لغت، مؤلف: وارث سرہندی ۱۶۱۵۔
وہ یورپین نسل کا آدمی جو ایشیائے کسی ملک میں پیدا ہوا ہو۔
- ۹۔ جامع اللغات، مؤلف و مرتب: خواجہ عبدالحمید، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۰ء)، ۲۸۴۔
وہ فرنگی جسے ہندوستان میں رہنے عرصہ ہو گیا ہو۔ ۲ یورپین نسل کا عیسائی۔ یوریشین، کرٹان، کرٹنا۔
- ۱۰۔ گوریاجے مور [Gloria J. Moore]، "A Brief History of the Anglo-Indian"، مشمولہ، *International Journal of Anglo-Indian Studies*، جلد ۱، شمارہ ۱، جرنل ایڈیشن (نیوز لیٹ، ۱۹۹۶ء)، ۵۱۔
اصل متن:

The East India Company directors in the seventeenth century paid one pagoda or gold mohur for each child born to an Indian mother and European father, as family allowance.

دیکھیے: <https://www.international-journal-of-anglo-indian-studies.org/index.php/IJAIS/article/view/78/71>

۱۱۔ گوریاجے مور [Gloria J. Moore]، "A Brief History of the Anglo-Indian"، مشمولہ، *International Journal of Anglo-Indian Studies*، ۵۱۔

اصل متن:

At every point of critical importance in the development of British Raj, Anglo-Indians were present. At the Mysore wars, at the Mahratta, Sikh, Afghan and Gurkha wars, Anglo-Indian or countryborn men fought and helped win victories, defending their fathers interests.

دیکھیے: <https://www.international-journal-of-anglo-indian-studies.org/index.php/IJAIS/article/view/78/71>

۱۲۔ انانیا کے ایس [Ananya K. S.]، ناویا شری جی سی [Navya Shree G C]، "Identity issues among young adult and middle-aged"، مشمولہ، *International Journal of Indian Psychology*، جلد ۳، شمارہ ۳، گجرات، انڈیا، ریڈیشن پبلی کیشنز، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۹ء، ۱۱۹-۱۳۲۔

اصل متن:

Most Anglo-Indians were happy with their Indian citizenship and were proud to be associated with it, while very few expressed some sort of discomfort or unfavourable attitude towards their nationality...The difference is visible between the two groups, where in the middle-adults are more comfortable in accepting their Indian nationality, but the young-adults are more sceptical towards unconditional acceptance.

۱۳۔ غلام عباس، غلام عباس کے بے مثال افسانے، ترتیب و انتخاب: طاہر منصور فاروقی، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۵۸۔

۱۴۔ ایضاً، ۲۲۱۔

۱۵۔ غلام عباس، دھنک، ترتیب: شفیق مرزا، عقیف طہ (لاہور: دارالعلم پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ۱۲۔

۱۶۔ سعادت حسن منٹو، منٹو نامہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ۵۸۸۔

۱۷۔ ایضاً، ۵۱۳۔

۱۸۔ ایضاً، ۶۳۱۔

۱۹۔ ایضاً، ۱۹۹۔

۲۰۔ سعادت حسن منٹو، بادشاہت کا خاتمہ (لاہور: القاب پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۳۵۔

۲۱۔ ایضاً، ۳۸۔

۲۲۔ ناصر عباس نیر، عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ۲۱۰۔

۲۳۔ عصمت چغتائی، کلیات عصمت چغتائی، مرتب: طارق محمود (لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۷ء)، ۷۷۔

۲۴۔ ایضاً، ۵۰۹-۵۱۰۔

۲۵۔ ایضاً، ۵۱۱-۵۱۲۔

۲۶۔ قرۃ العین حیدر، پت جھڑکی آواز (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۱۳۔

۲۷۔ ایضاً، ۱۶۔

۲۸۔ ایضاً، ۱۱۸۔

- ۲۹۔ قرۃ العین حیدر، قندیل چمن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۳۰۲-۳۰۳۔
- ۳۰۔ ایضاً، ۳۱۹-۳۲۰۔
- ۳۱۔ عصمت چغتائی، عصمت چغتائی کے شاہکار افسانے، مرتبہ: امر شاہد (پہلم: بک کارز، ۲۰۱۷ء)، ۱۷۴۔
- ۳۲۔ قرۃ العین حیدر، قندیل چمن، ۱۸۳۔
- ۳۳۔ سعادت حسن منٹو، منٹو نامہ، ۶۵۸۔
- ۳۴۔ پریم چند اور اس کے افسانے، مرتبہ: حفیظ گوہر (لاہور: گوہر پبلی کیشنز، س۔ن۔)، ۵۴۱۔
- ۳۵۔ ایضاً، ۲۱۰-۲۱۱۔
- ۳۶۔ انوار حسین ہاشمی، مرتبہ، بیسویں صدی کے بہترین افسانے (لاہور: بک ٹاک، س۔ن۔)، ۱۲۶۔
- ۳۷۔ سعادت حسن منٹو، منٹو راما (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ۷۰۸-۷۰۹۔
- ۳۸۔ کرشن چندر کے بہترین افسانے، مرتبہ: طارق محمود (لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۷ء)، ۲۴۶۔
- ۳۹۔ عصمت چغتائی، کلیات عصمت چغتائی، مرتبہ: طارق محمود، ۷۷۰-۷۷۵۔
- ۴۰۔ غلام عباس، دھنک، ترتیب: شفیق مرزا، عقیف طہ، ۱۲۔
- ۴۱۔ ایضاً، ۲۰۸۔
- ۴۲۔ ایضاً، ۲۰۸۔
- ۴۳۔ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں (کراچی: اوکسفر ڈیویژن پریس، ۲۰۱۳ء)، ۶۶۔
- ۴۴۔ سعادت حسن منٹو، منٹو راما، ۲۱۔
- ۴۵۔ کرشن چندر، ہم وحشی ہیں (پہلی: کتب پبلشرز لمیٹڈ، ۱۹۴۹ء)، ۴۹۔
- ۴۶۔ ایضاً، ۶۶-۶۷۔

Bibliography

- Abdulhameed, Khaja. *Jāmi' al-Lughāt*. Lahore: Urdu Science board, 2010.
- Aleeg, Bari. *Kampanī kī Hukūmat*. Lahore: Tayab Publishers, 2021.
- Amer Sahid. *ʿIṣmat Chughtā' ī kē Shahkār Afsānē*. Jehlum: Book Corner, 2017.
- Anwar Hussain Hashmi, *Bīsvīñ Ṣadī kē Behtarīn Afsānē*, Lahore: Book Talk.
- Hafeez Gohar. *Prēm Chand aur Us kē Afsānē*. Lahore: Gohar Publication.
- Haider, Qura Tul Ain. *Patjhar kī Āvāz*. Lahore: Sange Meel Publications, 2017.
- . *Qandīl-i-Chaman*. Lahore: Sange Meel Publications, 2013.
- Haqī, Shan al-Haq. *Oxford English-Urdu Dictionary*. Karachi: Oxford University Press, 2017.
- Manto, Saadat Hassan. *Bādshāhat kā Khātimah*. Lahore: Ilqa Publications, 2022.
- . *Māñṭō Nāmāh*. Lahore: Sange Meel Publications, 2007.
- . *Māñṭō Rāmā*. Lahore: Sange Meel Publications, 2015.
- Nayyar, Nasir Abbas. *Khāk kī Mahak*. Lahore: Sange Meel Publications, 2015.
- . *Māba'd Nau-Ābādiyāt: Urdū kē Tanāzur Maiñ*. Lahore: Sange Meel Publications, 2015.
- Shafiq Mirza, Afeef Taha. *Dhanak*. Lahore: Dar-ul Ilm, 1999.
- Tariq Mehmmod. *Krishan Chandar kē Behtarīn Afsānē*. Lahore: Book Talk, 2017.
- . *Kulliyāt-i-ʿIṣmat Chughtā' ī*. Lahore: Book Talk, 2017.
- Urdū Lughat: Tārīkhī Uṣūl Par*. Karachi: Taraqī Urdu Board, 1977.
- Waris Sarhindi. *Ilmī Urdū Lughat*. Lahore: Ilmi Kutab Khana, 1987.